ISSN: 2321-8339

جنوری - مارچ ۲۰۲۲ء

ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۲۲ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی **تحقیقات اسلامی** علی گڑھ

جلد:۴۱ شمارہ:۱

جمادی الاخریٰ ________ شعبان ۱۴۴۳ھ

جنوری ________ مارچ ۲۰۲۲ء

- مجلّہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر اپ لوڈ کر دیے گئے ہیں۔
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات tahqeeqat@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

موبائل: +91-9897746586

ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

اکاؤنٹ نمبر: Tehqeeqat-e-Islami, Union Bank of India

Muslim University, Aligarh

A/. No. 452201010029001, IFSC, UBIN0545228

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۵۰ روپے
سالانہ	۲۰۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۸۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں و ادارے)	۳۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۵ر امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۰ر امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۳۰ر امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۵ر امریکی ڈالر

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی۔۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

اس شمارے کے لکھنے والے

۱- ڈاکٹر غلام قادر لون

حدی پورہ، بارہ مولہ، کشمیر

dgqlone@gmail.com

۳- پروفیسر محمد سلیم

چیرمین ڈپارٹمنٹ آف تھیالوجی (سنّی)، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

msaleem196330@gmail.com

۲- ڈاکٹر فیاض احمد فاروق

سابق ریسرچ اسکالر، اسلامک اسٹڈیز سینٹر، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان (پاکستان)

fayyazahmadfarooq@gmail.com

۴- مولانا محمد انس فلاحی مدنی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

anasfalahi@gmail.com

۵- جناب فضل الرحمٰن محمود

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ حدیث، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد (پاکستان)

۶- پروفیسر کنور محمد یوسف امین

ڈائریکٹر سینٹر فار اسٹڈی اینڈ ریسرچ، نئی دہلی

kmya55@yahoo.com

۷- سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حرف آغاز

اسلام کا نظامِ شوریٰ

رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ مبارک

——————سید جلال الدین عمری

رسول اکرم ﷺ ملکی مسائل کبھی تمام اہل مدینہ سے براہِ راست مشورے سے طے فرماتے تھے اور کبھی گفتگو مہاجرین وانصار کے نمائندوں تک محدود رہتی۔ بنیادی اور اہم معاملات میں بالعموم پہلی صورت اختیار کی جاتی اور دوسری صورت بھی اہل مدینہ کی تائید اور اتفاق کا باعث ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق (عہد وپیمان) لیا تھا کہ وہ اس کی ہدایات کے پابند رہیں گے۔ اس کی نگرانی کے لیے بنی اسرائیل کی بارہ شاخوں کے بارہ نقباء متعین کیے گئے۔ نقباء نقیب کی جمع ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں تحقیق وتفتیش اور چھان بین کرنے والا۔ ان نقباء کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس بات پر نظر رکھیں کہ احکامِ الٰہی کی پابندی ہورہی ہے اوران کی خلاف ورزی نہیں کی جارہی ہے۔ (المائدۃ:۱۲)

عرب میں قبائل کے نمائندے ہوتے تھے۔ ان نمائندوں کو 'عرفاء' کہا جاتا تھا۔ 'عرفاء' عریف کی جمع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہر قبیلہ کا عریف ہوتا جو اس کی نمائندگی کرتا اور وقت ضرورت قبیلہ کے امور پر آپ سے بات کرتا۔

مشہور شارحِ حدیث امام خطابی المتوفی ۲۷۵ھ نے عریف کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

العريف القيم بأمر القبيلة ويلي امورهم و يتعرف الامير منه احوالهم قال الشاعر:

عریف قبیلہ کے نگراں کو کہتے ہیں جوان کے معاملات کی سرپرستی کرتا ہے اور امیر اس کے ذریعہ ان کے احوال سے واقف ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

او کلما وردت عکاظ قبیلة
بعثوا الیّ عریفهم یتوسم [۱]

(جب عکاظ کے میلہ میں کوئی قبیلہ آتا تو میرے پاس اپنا نمائندہ بھیجتے جس میں خیر اور بھلائی نمایاں ہوتی)

جس وقت انصار نے بیعت عقبہ میں آں حضرت ﷺ کی حمایت ونصرت کا حلف اٹھایا تھا اس وقت آپ نے انصار سے فرمایا کہ تم اپنے نمائندوں کو پیش کرو جو اپنی اپنی قوم کی تائید وحمایت کا ذمہ دار بنے، چنانچہ اسی وقت وفدِ مدینہ نے قبیلۂ خزرج کی مختلف شاخوں کے نو اور قبیلۂ اوس کے تین نمائندے حاضر کیے جنہوں نے وفاداری ونصرت کا عہد کیا۔[۲]

جنگِ ہوازن میں مال غنیمت اور بہت سارے قیدی عسکرِ اسلام کے ہاتھ آئے۔ اسلامی ضابطۂ جنگ کے مطابق ان قیدیوں کو فوج کے درمیان تقسیم کردیا گیا اور وہ غازیوں کی ملکیت قرار پائے۔ تقسیم کے بعد قبیلۂ ہوازن نے دربارِ رسالت میں اپنے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کی یہ درخواست غازیانِ اسلام کے روبرو رکھی اور اس سلسلہ میں سفارش فرمائی۔ جس پر ساری فوج کی جانب سے آمادگی کا اظہار ہونے لگا، لیکن اس سے واضح طور پر یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون اس پر آمادہ ہے اور کون نہیں، اس لیے آپؐ نے فرمایا:

۱۔ معالم السنن: ج ۲، ص ۴

۲۔ سیرت ابن ہشام: ص ۲۹۷۔ تاریخ کامل: ج ۲، ص ۴

إنّــا لانـدری من أذن مـنـكـم فـی ذالک ممّن لم يأذن فارجعوا حتی یـرفـع إلینا عرفاء کم أمر کم فرجع الناس و کلمهم عرفائهم ثم رجعوا إلیٰ رسـول الـلـه فاخبروه انهم قد طیبوه۔[۱]	ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں دی۔ لہٰذا آپ لوگ لوٹ جائیں اور ہمیں آپ کے سردار آپ کی مرضی سے مطلع کریں۔ پس لوگ لوٹ گئے اور ان سے ان کے سرداروں نے گفتگو کی، بعد ازاں سردارانِ قبائل نے آں حضرت ﷺ کو اطلاع دی کہ وہ بخوشی اس پر آمادہ ہیں۔

اس واقعہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ دورِ رسالت میں قبائل کے باقاعدہ نمائندے پائے جاتے تھے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے قبیلے کے خیالات اور ان کی مرضی وناراضی کے ترجمان ہوتے تھے۔ تیسری یہ کہ آں حضرت ﷺ ان قبائل کے رجحانات سے واقف ہوئے بغیر کوئی اجتماعی فیصلہ نہیں فرماتے تھے۔

امام ابوداؤد نے ایک شخص کی زبانی دورِ رسالت کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ اور اس کے چشمے کا قیم اور ذمہ دار تھا۔ جب منادیٔ اسلام کی صدا اس کے گوشِ حق نیوش تک پہنچی تو اس نے اس صدا پر لبیک کہی اور اپنی قوم کو ایک سو اونٹ دے کر اسلام قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا، لیکن وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ اس لیے اس نے اپنے اونٹ واپس لینے کا ارادہ کیا اور اپنے اس ارادہ کی اطلاع اپنے ایک لڑکے کے ذریعہ سے رسول اکرم ﷺ کو دی اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ اس کے لڑکے کو اس کے بعد قبیلہ کا قیم بنا دیا جائے۔ آں حضرت ﷺ نے پہلی درخواست منظور کرتے ہوئے فرمایا کہ تیرا باپ اگر اونٹ واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے کیوں کہ اگر قبیلہ نے اسلام نہیں قبول کیا تو اس سے جنگ کی جائے گی۔ دوسری درخواست چوں کہ روحِ اسلام کے منافی تھی اس لیے نہایت ہی لطیف انداز میں اس سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا:

۱۔ بخاری: کتاب المغازی، باب قول اللہ یوم حنین الخ۔ سیرت ابن ہشام، ص ۸۷۶۔۸۸۸۔

ان العرافة حق ولا بد للناس من عرفاء ولکن العرفاء فی النار [۱]

قیمی حق ہے اور لوگوں کے لیے قیمین کا پایا جانا حددرجہ ضروری ہے، لیکن قیمین دوزخ میں جائیں گے (اگر وہ قبائل کے حقوق ٹھیک سے ادا نہ کریں۔)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ حقیقت بھی آشکار کردی کہ محض سیادت اور حکم رانی کے جذبہ سے قیّم بن جانا اور فی الواقع اس کا اہل نہ ہونا ہلاکت وتباہی کا موجب ہے۔

عرب کے نظام میں جو سردارانِ قبائل ہوتے تھے ان کے اندر جود وسخا، جرأت وشجاعت، حمیت، ایثار و بے نفسی جیسی اخلاقی خوبیاں ہوتی تھیں۔ جن کی وجہ سے قبائل کی نگاہیں سیادت وقیادت کے لیے ان کی طرف اٹھتی تھیں اور ان کی سیرت وکردار پر قوم کو اس قدر اعتماد ہوتا تھا کہ وہ اس کے فیصلہ کو بے چون وچرا تسلیم کر لیتے تھے۔ اوس بن خولی کے بارے میں آتا ہے کہ ان کا شمار کامل افراد میں ہوتا تھا۔ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں کامل اسے کہا جاتا تھا جو عربی لکھ سکتا ہو، تیراکی اور تیراندازی کا ماہر ہو۔ اوس بن خولی میں یہ اوصاف موجود تھے۔[۲]

عرب جن خوبیوں کو کمال سمجھتے تھے آج ان کی جگہ دوسری خوبیوں نے لے لی ہے، لیکن ان خوبیوں کو موجودہ دور نے اپنے ہی ہاتھوں ضائع کردیا ہے۔ اس کے نمائندے بالعموم دون ہمت اور ناقابلِ اعتماد سیرت واخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔ جن سے عوام کی بھلائی کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ جو امیدیں ان سے وابستہ کی جاتی ہیں وہ پوری نہیں ہوتیں اور جو حسین خواب وہ دکھاتے ہیں ان کی تعبیر کبھی عالم واقعہ میں نہیں دیکھی جاتی۔

۱۔ ابوداؤد، اول کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب فی العرافۃ۔

۲۔ طبقات ابن سعد: ۵۴۶/۳

اس وقت ایک واقعہ کا تذکرہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عرب کے نظام میں سردارانِ قبائل کی کیا حیثیت تھی اور قوم ان پر کیوں اعتماد کرتی تھی۔ پھر یہ کہ اسلام نے صرف نمائندوں کی رائے کو قوم کی رائے کا ہم معنی کیوں سمجھا۔ حضرت سعدؓ کے بارے میں آتا ہے کہ: ''کان سیدا جوادا''[۱]

حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے پوچھا اے بنو مسلمہ تمہارا سردار کون ہے؟ ہم نے جواب دیا: جد بن قیس۔ لیکن ہم اس میں ایک خامی پاتے ہیں، وہ یہ کہ وہ بخیل ہے، اپنی دولت قوم کی فلاح و بہبود پر صرف نہیں کرتا۔ آں حضرتؐ نے تعجب آمیز انداز میں فرمایا: سردار اور بخیل! بخالت سے بری بھی کوئی بیماری ہوسکتی ہے؟ آج سے تمہارے سردار عمرو بن الجموحؓ ہوں گے۔[۲]

یہاں چند قومی واجتماعی فیصلوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔ جن سے دورِ رسالت کے شورائی نظام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱) غزوۂ بدر

ہجرت کے دو ہی سال بعد معرکۂ بدر پیش آیا۔ جو اسلامی تاریخ میں بہت ہی اہم اور دور رس نتائج کا حامل رہا ہے۔ تاریخ کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس اہم اور فیصلہ کن معاملہ میں باہم مشورے اور اجتماعی تائید کے بعد ہی اقدام کیا گیا۔ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ رسول اللہ ﷺ نے نمائندگانِ قوم کو نظر انداز کر کے محض اپنی ذاتی رائے سے یہ فیصلہ فرمایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے معاملہ کے تمام نشیب وفراز صحابۂ کرام کے سامنے کھول کر رکھ دیے کہ شام سے

۱۔ ان کے جذبۂ سخاوت کی کیفیت کے لیے ملاحظہ ہو مستدرک حاکم: ۲۵۳/۳

۲۔ الاستیعاب لابن عبدالبر تذکرۂ عمر و بن الجموح، الاصابۃ فی تمیز الصحابہ، ج۲، ص۵۲۹، نمبر ۵۷۹۷۔ اس واقعہ کی تفصیل میں کسی قدر اختلاف ہے۔ طبقات ابن سعد: ج ۳، ص ۵۷۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بشر بن براء بن معرور کو سردار مقرر کیا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو: مستدرک حاکم ۲۰۹/۳

ابوسفیان کا تجارتی قافلہ آرہاہے۔ ساتھ ہی اس بات کا قوی امکان ہے کہ قافلہ کی حفاظت کے لیے مکہ کی ساری عسکری قوت میدان میں کود پڑے۔ مجھ سے اللہ نے وعدہ کیاہے کہ پرستارانِ حق کا ان دونوں میں سے کسی ایک سے مقابلہ ہوکر رہے گا۔ اگر قافلہ سے مقابلہ ہواتو مال غنیمت لے کر لوٹیں گے اور دشمنانِ حق کی مالی پوزیشن کو بڑی حدتک کم زور کرسکیں گے۔ لیکن اگر قریش کی فوج سے ٹکراؤ ہوگیا تو یہ حق وباطل کی مقابلہ آرائی ہوگی۔ جس میں یقین ہے کہ فتح ونصرت کا پرچم حق کے ہاتھ میں ہوگا اور پرچمِ باطل سرنگوں ہوگا۔

یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ (جنھیں ہم مہاجرین کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں) نے تقریر کی اور کہا کہ ہم میدانِ جنگ کی طرف سربکف نکلنے کے لیے تیار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت کے لیے ہمارے آخری قطرۂ خون کی ضرورت ہوتواس سے بھی دریغ نہ ہوگا، بلکہ یہ توہماری سعادت اور سرخ روئی ہوگی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اور دیگر نمائندگانِ مہاجرین نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کی تائید کی۔

ان عزم سے بھرپور اور حوصلہ افزا تقریروں کے سننے کے باوجود آں حضرت ﷺ کا روئے سخن کسی اور ہی طرف تھا۔ آپ انصار کے عندیہ سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ کیوں کہ ایک تو کثرت ان ہی کی تھی اور دوسرے یہ کہ انصار نے حمایت کا وعدہ مدینہ پر فوج کشی کی صورت میں کیا تھا۔ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا ان پر ضروری نہیں تھا، لیکن جب انصار نے محسوس کیا کہ ذاتِ اقدس کا خطاب ہم ہی سے ہے تو نمائندگانِ انصار نے بھی اس کی پُر زور حمایت کی اور کہا کہ حضور حکم دیں تو ہم سمندر کا سینہ چیر کر آگے نکل جائیں۔ ہم حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح یہ جواب نہیں دیں گے کہ جاؤ تم اور تمہارا رب دشمن سے مقابلہ کرو ہم میں تابِ نبرد آزمائی نہیں۔ ان پُر جوش کلمات کے بعد آں حضرتؐ نے اپنی

۱۔ مسلم: کتاب الجہاد والسیر، باب غزوۂ بدر، حدیث نمبر: ۱۷۷۹ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ، ج ۳۔ ہم نے ان ہی روایات کو لیا ہے جو مسلم کے اجمال سے مطابقت رکھتی ہیں۔

رائے کو آخری شکل دی۔ اس طرح قوم کے اجتماعی فیصلہ سے معرکۂ بدر قائم ہوا۔[۱]

(۲) میدانِ جنگ کا انتخاب

میدانِ بدر میں جب فوج پڑاؤ ڈال چکی تو حباب بن منذرؓ نے آں حضرتؐ سے دریافت فرمایا کہ یہ مقام جہاں کہ فوج اس وقت خیمہ زن ہے کیا اس کا تعین زبانِ وحی نے کیا ہے یا جنگی تدبیر اور آپ کی رائے اس کی باعث ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو ہم مجالِ دم وزن نہیں رکھتے، لیکن اگر دوسرا پہلو ہے تو جنگی تدبیر کا تقاضا ہے کہ ہم پانی کے چشموں پر قبضہ کرلیں، تاکہ قریش ضرورت پر پانی نہ پاسکیں۔ حضورؐ نے اس کی تائید کی۔ فرمایا: تم نے بہت صحیح رائے دی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق عمل ہوا۔[۱]

اس سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوئی کہ امورِ وحی ورسالت کے علاوہ بقیہ تمام اجتماعی معاملات میں صحابہ کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔

(۳) ابوالعاص کا فدیہ

جنگِ بدر نے مسلمانوں کے حق میں کام یابی کا اعلان کیا اور مشرکینِ مکہ کی سیاہ تاریخ میں ایک اور صفحہ کا اضافہ ہوا۔ مسلمانوں کو بہت سامال اور ستر (۷۰) قیدی ہاتھ آئے۔ ان قیدیوں میں آں حضرتؐ کے داماد ابوالعاص بھی تھے جنھوں نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ آں حضرتؐ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ اسلام لانے کے باوجود ابوالعاص کے ماتحت مکہ ہی میں تھیں۔ جب حضرتِ زینبؓ کو اپنے شوہر کی گرفتاری کی اطلاع ملی اور یہ بھی کہ بغیر فدیہ کے کسی کو رہا نہیں کیا جارہا ہے تو حضرت زینبؓ نے فدیہ میں وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں انھیں دیا تھا۔ اس ہار کے دیکھنے کے بعد آں حضرتؐ پر انتہائی تاثر اور رقت کا عالم طاری ہوگیا۔ حضرت خدیجہؓ اور لختِ جگر حضرت زینبؓ کی یاد نے آپ کو بہت متاثر کیا۔ آپ چاہتے تھے کہ یہ ہار حضرت زینبؓ ہی کو واپس کردیں، لیکن یہ چوں کہ عام مسلمانوں کی ملکیت بن چکا تھا اس لیے

۱۔ سیرت ابن ہشام، ص ۴۳۹، البدایۃ والنہایۃ: ج ۳، ص ۲۶۷

آپ کو صحابہ سے اجازت لینی پڑی۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا اگر تم بہتر سمجھو تو ابوالعاص کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا جائے اور یہ ہار زینبؓ کو واپس کر دیا جائے۔ صحابہ کرامؓ بخوشی اس پر آمادہ ہو گئے اور ہار واپس کر دیا گیا۔[۱]

(۴) غزوۂ احد

غزوۂ احد کے موقع پر آں حضرت ﷺ کی پالیسی نے شوریٰ کی اہمیت اور اس کی قانونی حیثیت کو بے میل اور نکھار کر رکھ دیا ہے۔ جس وقت آں حضرت کو یہ اطلاع ملی کہ قریش کا بے پناہ لشکر پورے جوشِ انتقام کے ساتھ مدینہ کی طرف رُخ کر رہا ہے تو آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا اور آپ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں رہ کر باہر سے حملہ آور دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کا تفصیلی نقشہ بھی آپ نے صحابہ کے سامنے پیش کیا تھا لیکن صحابہ کی اکثریت نے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس میں خصوصیت سے وہ لوگ جو کسی وجہ سے ثوابِ بدر سے محروم رہ گئے تھے، پیش پیش تھے اور شوقِ جہاد اور باطل کی سرکوبی کے ولولہ میں بار بار کہتے تھے اگر ہم میدانِ جنگ میں تلوار کے ذریعہ سے دین حق کی حفاظت نہیں کر سکتے اور دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو پھر کیا کر سکیں گے؟ ہم اسی دن کے بہ دل وجان متمنی تھے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی التجا کرتے تھے۔ جب یہ موقع اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے تو اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ حافظ ابن کثیرؒ روایت نقل کرتے ہیں:

وابیٰ کثیر من الناس الا الخروج الی العدوّ ولم یتناھوا الی قول رسول اللہ ورأیہ۔[۲]	اکثریت مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے پر مصر تھی اور انہوں نے آں حضرت کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

جب رسول اللہ ﷺ نے اکثریت کی رائے کو اپنی رائے کے خلاف پایا تو آپ نے اپنی رائے تبدیل فرمالی اور خارجِ مدینہ چل کر مقابلہ کا فیصلہ کر لیا اور گھر سے فوجی

۱۔ سیرۃ ابن ہشام، ص ۴۳۹۔ البدایہ والنہایۃ: ۳/۲۶۷

۲۔ البدایۃ والنہایۃ: ۴/۱۲

لباس میں نمودار ہوئے۔ اتنے میں بعض اربابِ فہم وبصیرت نے خیال کیا کہ شاید ہمارا یہ مشورہ مرضیٔ خداوندی کے خلاف ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسی کوئی صورت ہوتو یہ ایک افسوسناک اور تباہ کن بات ہوگی۔ اس لیے آں حضرتؐ ہی کی رائے پر عمل کیا جائے۔

فلما رأیٰ ذالک رجال من ذوی الرأی قالوا امرنا رسول الله ان نمکث بالمدینة وهو اعلم بالله ومایرید ویأتیه الوحی فقالوا یارسول الله امکث کما امرتنا[۱]

آں حضرت کے تیار ہوجانے کے بعد بعض اصحابِ رائی نے کہا کہ آں حضرت نے مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کا حکم دیا تھا (ہم نے آپ کی رائے کے خلاف مشورہ دیا، نہیں معلوم کہ ہمارا یہ مشورہ کسی حکم الٰہی کے خلاف پڑتا ہو) اس لیے کہ آں حضرتؐ (اللہ اور اس کی منشا ومراد سے زیادہ واقف ہیں) آپ کے پاس وحی آتی ہے، آپ کی رائے وحی ہی پر مبنی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے کہا یارسول اللہ ﷺ مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کیا جائے جیسا کہ آپ کا حکم تھا۔

ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کی رائے میں یہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہ مدینہ سے باہر چل کر مقابلہ کرنا منافیٔ حکمت و دانش مندی سمجھتے تھے۔ بلکہ اس تبدیلی کا واحد سبب محض یہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ حکم بربنائے وحی نہ دیا گیا ہو۔ اس وجہ سے آں حضرتؐ نے جواب دیا کہ نبی جب اپنا جنگی لباس پہن لیتا ہے تو جنگ کیے بغیر اسے نہیں اتارتا۔

یعنی وہ فیصلہ سے پہلے مشورہ کرتا ہے۔ مشورے کے بعد جب کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے تو محض غلط فہمیوں اور بے بنیاد قیاس آرائیوں پر اپنی رائے نہیں تبدیل کرتا۔ صحابۂ کرامؓ اگر مذکورہ بالا رائے محض اندیشہ کی بنیاد پر نہیں، بلکہ جنگی مصالح کے تحت پیش کرتے تو جس طرح آپؐ نے اپنی پہلی رائے بدل دی تھی اسی طرح دوبارہ بھی تبدیل فرما سکتے تھے۔

(۵) جنگِ خندق

خندق کی جنگ دراصل تمام قبائل عرب سے مقابلہ کے مترادف تھی اور اس

۱۔ سیرت ابن ہشام: ص ۵۵۸۔ البدایة والنهایة: ۱۳/۴

میں مٹھی بھر مسلمانوں کے لیے رُو در رُو مقابلہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے حضرت سلمانؓ فارسی نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا تاکہ مدینہ پر مشرکین کا یہ ٹڈی دل لشکر یلغار نہ کردے۔ چنانچہ حضرت سلمانؓ کے مشورے کے مطابق مدینہ کے چاروں طرف خندق کھودی گئی۔[1]

اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہ محسوس کیا کہ صحرائے عرب کی ہر جانب سے اٹھا ہوا یہ طوفان آسانی سے فرو نہیں ہوسکتا تو آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس جمعیت سے قبیلۂ غطفان کو توڑ لیا جائے۔ چنانچہ آپ نے قبیلۂ غطفان کے سرداروں (عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف) سے اس شرط پر صلح کرنی چاہی کہ ان کا قبیلہ مسلمانوں کی جنگ سے باز آئے اور مسلمان اس کے عوض سالانہ مدینہ کی آدھی فصل انہیں دے دیں گے۔ تکمیلِ صلح سے قبل آپ نے مشورہ ضروری سمجھا اور سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ سے رائے لی۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ حکم من جانب اللہ ہے یا آپ نے اسے ہمارے حق میں بہتر سمجھ کر اختیار فرمایا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ میں اپنی رائے ظاہر کررہا ہوں۔ اسے تمہارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ اس وقت عرب کے تمام قبائل تمہیں ایک ہی تیر سے ہدف بنائے ہوئے ہیں اور تم پر درندوں کی طرح ہر طرف سے ٹوٹ پڑنے پر تیار ہیں، اگر میری رائے کے مطابق قبیلۂ غطفان کو مشرکین سے توڑ لیں تو ان کا شیرازہ پارہ پارہ ہوسکتا ہے۔

یہ سن کر سعد بن معاذؓ نے جواب دیا کہ ایک وہ دور تھا جب ہم جہالت کی ظلمتوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے اور ہمارے پاس دینِ حق کی کوئی روشنی نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ قبائل بزور ہم سے کھجور کا ایک دانہ نہیں لے سکتے تھے اور آج جب کہ اللہ نے ہمیں حق کی دولت سے نوازا ہے اور صداقتِ ایمان کی قوت عطا فرمائی ہے۔ کیا انہیں خراج دینے پر راضی ہوجائیں؟ ہمارے درمیان تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ جواب سن کر معاہدہ چاک کردیا۔[2]

اس واقعہ کو علامہ ابن عبدالبر المتوفی ۴۶۳ھ نے جن الفاظ میں محفوظ کیا ہے

۱۔ طبری: ج ۳، ص ۴۴

۲۔ طبری: ج ۳، ص ۴۸، کتاب الخراج: ص ۲۴۶

اس سے اس پوری بحث کو خاص تقویت پہنچتی ہے:

فارسل رسول اللہؐ الی سعد بن معاذ وسعد بن عبادہ دون سائر الانصار لانهما کانا سیدا قومهما کان سعد سید الاوس و سعد بن عبادہ سید الخزرج. فشاورهما فی ذالک فقالا یا رسول اللہ ان کنت امرت بشیءٍ فافعله وامض له وان کان غیر ذالک فواللہ لانعطیهم الا السیف فقال رسول اللہ لم اومر بشیء لو امرت بشیء ماشاورتکما قط وانما هو رأی اعرضه علیکما فقالا واللہ یا رسول اللہ ماطمعوا بذالک منا قط۔[۱]

رسول اللہؐ نے اپنا قاصد تمام انصار کے بجائے صرف سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کے پاس بھیجا۔ کیوں کہ یہ دونوں اپنے اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ سعد بن معاذؓ اوس کے سردار تھے اور سعد بن عبادہؓ خزرج کے۔ آپ نے ان دونوں سے اس معاملہ میں مشورہ کیا۔ ان دونوں نے کہا کہ یارسول اللہ! اگر آپ کو اس کا حکم دیا گیا ہے تو اس میں مشورہ کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کر گزریے۔ لیکن اگر یہ حکم نہیں ہے تو قسم خدا کی ہم تلوار ہی سے ان کا فیصلہ کریں گے۔ آپ نے فرمایا: مجھے اللہ نے اس معاملہ میں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ اگر مجھے حکم ملا ہوتا تو تم سے مشورہ کیوں کرتا۔ یہ تو میری ایک رائے ہے جسے میں تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں تو ان دونوں نے جواب دیا: واللہ یارسول اللہ ان لوگوں نے کبھی بھی ہم سے اس قسم کے خراج کی توقع نہیں کی تھی۔

اس بیان سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کو من جانب اللہ کوئی حکم نہ ہوتا آپ اپنی رائے کو رائے ہی کی حد تک رکھتے تھے۔ انتظامی نوعیت کے معاملات میں آپ کی رائے کے خلاف کسی دوسری رائے کا اظہار نہ صرف جائز تھا، بلکہ بسا اوقات ضروری خیال کیا جاتا تھا اور یہ کہ آپؐ ایسے تمام معاملات میں اپنی انفرادی رائے کو بہ جبر مسلط نہیں فرماتے تھے۔

۱۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب: تذکرۂ سعد بن عبادہ۔

(۶) غزوۂ طائف

قبیلہ ثقیف اپنی قوت وتوانائی اور مستحکم قلعوں کی وجہ سے طائف کا ایک ممتاز قبیلہ تھا۔شوال ۸ھ کو لشکر اسلام نے اس کا محاصرہ کیا۔لیکن محارب قبیلہ نے میدان کارزار میں دوبدو نبرد آزما ہونے کے بجائے قلعہ بند ہوکر مقابلہ کرنا شروع کیا۔اس سے مسلمانوں کو کامیابی دشوار ہوگئی۔یہ کیفیت دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے بعض اصحاب کے مشورے سے محاصرہ ختم کردینا چاہا اور اپنی رائے صحابہ کے سامنے پیش کی۔لیکن صحابہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور عرض پرداز ہوئے کہ اس قدر سعی وکاوش کے بعد فتح وکامرانی کا علم بلند کیے بغیر واپسی نہ کی جائے۔ اکثریت کی رائے معلوم ہوجانے کے بعد نبی ﷺ نے دوبارہ حملہ کی اجازت دے دی۔ چنانچہ دوسرے دن حملہ ہوا لیکن کل سے بھی خراب نتیجہ سامنے آیا اور اسلامی فوج کو بہت نقصان اٹھانا پڑا، یہ دیکھ کر رسولِ خدا نے پھر اپنی رائے کا اعادہ فرمایا، چوں کہ اب صحابہ کے روبرو آپ کی وقیع رائے کے واضح نتائج روزِ روشن کی طرح کھل کر آگئے تھے اس لیے صحابہ نے بھی آپ کی ہم نوائی کی اور اسلامی فوج واپس ہوئی۔[۱]

(۷) واقعۂ افک

مشہور واقعہ ہے کہ بعض منافقین نے حضرت عائشہؓ پر بہتان تراشا تھا۔جس کے ذریعہ ایک طرف آں حضرتؐ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عائشہؓ جیسی بے داغ اور پاکیزہ سیرتوں پر گندگی اچھالنے کی سعی کی جارہی تھی اور دوسری طرف مسلم سوسائٹی کے بخیے ادھیڑنے کی فکر ہورہی تھی۔یہ ناپاک سعی اس قدر شدت کے ساتھ جاری تھی کہ اس کی لپیٹ میں بعض نیک اور سادہ لوح مسلمان بھی آگئے۔ حالات نے اس مسئلہ کو ایک اجتماعی مسئلہ کی شکل دے دی۔آں حضرت ﷺ نے انفرادی رائے ومشورہ کے بعد انصار ومہاجرین سے دریافت کیا کہ اس نازک مرحلہ میں کیا تدابیر اختیار کی جائیں، لیکن پوری

۱۔ بخاری، مسلم غزوۂ طائف، تفصیل ملاحظہ ہو زرقانی علی المواہب: ج ۳، ص ۲۸ تا ۳۵۔

قوم اور خصوصیت سے انصار کی دو پارٹیوں اوس وخزرج میں اتفاق ہونے سے قبل وحی الٰہی نے اس عقدے کو حل کر دیا اور اجتماعی فیصلہ کی نوبت نہیں آئی۔[۱]

دورِ رسالت کے یہ چند نمایاں اور معروف واقعات ہیں جن میں سے ہر ایک واقعہ کو آخری شکل صحابہ کرام کی متفقہ رائے ہی سے دی گئی ہے بلکہ بسا اوقات رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی رائے کے سامنے آجانے کے بعد اپنی رائے تبدیل بھی فرمائی ہے۔

انتخاب خلیفہ میں شوریٰ کی اہمیت

اسلامی ریاست کے لیے خلیفہ کا انتخاب ایک لازمی عمل ہے۔اس کے لیے شوریٰ کی اہمیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے دو تین ارشادات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔اس کے ساتھ آپ کے اسوۂ مبارک کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔اس کے بعد ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ مستند علما و محققین نے اس کی کیا تشریح کی ہے۔

عن علیؓ قال قال رسول اللہ لو کنت مؤمرا احدا من غیر مشورة منهم لأمّرت ابن ام عبد[۲]	حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ اگر میں ان سے بغیر مشورہ کے کسی کو امیر بناتا تو عبداللہ بن مسعود کو بناتا۔

یہ حدیث اس بحث میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔رسول اللہ ﷺ کی رائے میں ایک شخص مستحقِ خلافت ہے، لیکن آپ اپنی رائے کو اس لیے عملی جامہ نہیں پہنا رہے

۱۔ صحیح بخاری: کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ لولا اذ سمعتموہ الخ۔اس کی تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔اس عاجز نے 'مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں' میں اس کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

۲۔ یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے سے فرق سے حدیث کی کئی کتابوں میں موجود ہے۔ یہاں ترمذی کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔ کتاب المناقب، مناقب عبداللہ بن مسعودؓ، حدیث نمبر ۳۸۰۸۔ ابن ماجہ، مقدمہ، فضل عبداللہ بن مسعود، حدیث نمبر ۱۳۷، مسند احمد، جلد اول، حدیث نمبر ۵۶۶۔ اس کے ایک راوی حارث محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ لیکن مستدرک حاکم ۳۵۹/۳ حدیث نمبر ۵۳۸۹ میں یہ روایت عاصم بن حمزہ سے آئی ہے۔ان پر بھی جرح کی گئی ہے لیکن وہ ثقہ ہیں۔اس لیے حارث کے سلسلے میں تو ضعف ہے۔لیکن عاصم بن حمزہ کی سند صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو مسند احمد تحقیق، احمد محمد شاکر، ج ا ص ۴۰۸

ہیں کہ اس سے شورائیت کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو امت کا بہترین فرد اور خلافت کا سب سے زیادہ مستحق جاننے اور مرض الموت میں تک جانشینی کی فکر کے باوجود نامزد نہیں فرمایا۔

ایک مرتبہ آں حضرتؐ سے دریافت کیا گیا: من یؤمر بعدک ؟ آپ کے بعد کسے امیر بنایا جائے؟ آپ نے جواب دیا: ''اگر تم ابو بکر کو امیر بناؤ گے تو اسے دنیا سے بے نیاز اور آخرت کی طرف راغب پاؤ گے۔ اگر عمر کو امیر بناؤ گے تو اسے ایک قوی ترین شخص، امانت دار اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کی پروا نہ کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم علیؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے ہدایت یافتہ اور ہدایت کی طرف راہ نمائی کرنے والا پاؤ گے۔ وہ تمھیں صراط مستقیم پر لے چلے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم اسے امیر نہیں بناؤ گے۔''[۱] یعنی امت کا اس پر اتفاق نہ ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کا ذاتی رجحان خلافت کے سلسلہ میں مذکورہ بالا بزرگوں کی طرف تھا، لیکن آپ نے انھیں خلیفہ نہیں مقرر کیا بلکہ صرف اپنی ذاتی رائے کے اظہار پر اکتفا کیا۔ حضرت علیؓ کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ امت کا آپ کی خلافت پر اتفاق نہ ہوگا۔ اس لیے آپ نے حضرت علیؓ کو خلافت کے لیے نامزد کیا اور نہ امت کو اس کا حکم دیا تاکہ شورائیت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس قسم کے فیصلے امت کے اربابِ حل وعقد ہی کیا کرتے تھے اور امت اسے بے چون وچرا قبول کر لیتی تھی۔

انتخاب خلیفہ ہی کا مسئلہ لیجیے۔ چاروں خلفاء کے انتخاب کی یہی صورت رہی ہے کہ امت کے اربابِ بست وکشاد نے کسی کے انتخاب پر اتفاق کر لیا اور امت اس پر متفق ہوگئی لیکن جیسا کہ ہم نے کہا یہ طبقہ امت کے میلانات کو نظر انداز کر کے کسی کو خلیفہ نہیں منتخب کرتا تھا۔

۱۔ مسند احمد حدیث نمبر ۸۵۹، طبرانی اوسط، بزار۔ اس کے ہم معنی حدیث مستدرک میں بھی ہے۔ ج ۳ ص ۷۰، حدیث نمبر ۴۴۳۵۔ امام ذہبیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، لیکن مشہور محدث احمد محمد شاکر کہتے ہیں: 'اسنادہ صحیح'۔ مسند احمد، جلد ۱، ص ۵۳۷۔

علامہ ماوردیؒ انتخابِ خلیفہ کی صورت اس طرح پیش کرتے ہیں:

فاذا اجتمع اهل العقد والحل للاختيار تصفحوا احوال اهل الامامة الموجودة فيهم شروطها فقدموا للبيعة منهم اكثرهم فضلا واكملهم شروطا ومن يسرع الناس الى طاعته ولا يتوقفون عن بيعته فاذا تعين لهم من بين الجماعة من اداهم الاجتهاد الى اختياره عرضوها عليه فان اجاب اليها بايعوه عليها وانعقدت بيعتهم له فلزم كافة الامة الدخول في بيعته والانقياد بطاعته۔[۱]

جب اہل حل وعقد امیر کے انتخاب کے لیے جمع ہوں گے تو ان اشخاص کے حالات پر غور کریں گے جن میں امامت کی شرطیں پائی جاتی ہیں اور وہ بیعت کے لیے اس شخص کو آگے بڑھائیں گے جو ان میں سب سے افضل ہو اور جس میں امامت کی شرائط بدرجۂ اتم پائی جاتی ہوں اور یہ کہ لوگ کس کی اطاعت کی طرف تیز گامی دکھائیں گے اور اس کی بیعت کے لیے پس پیش نہیں کریں گے۔ اور جب ان کی تحقیق واجتہاد ان میں سے کسی ایک کو چن لے تو منصب امامت اس شخص کے سامنے پیش کریں گے اور اگر وہ اسے قبول کرلے تو وہ سب اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور ان کی بیعت اس شخص کے حق میں منعقد ہوجائے گی اور ساری امت کو اس بیعت میں داخل ہونا اور اس کی اطاعت قبول کرنا لازم ہوجائے گا۔

اہل حل وعقد کو چوں کہ پوری قوم کا اعتماد حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے فیصلہ

۱۔ الاحکام السلطانیہ: ص ۵

کے بعد کسی شخص کو اس کے ردو انکار کا حق نہیں رہتا اور ایسا شخص خارج عن الجماعۃ سمجھا جائے گا۔

مشہور محدث ابن بطال کہتے ہیں:

المراد بالجماعة اهل الحل والعقد من كل عصر۔[۱]	الجماعۃ سے مراد ہر دور کے اہل حل وعقد ہیں۔

محدث کرمانیؒ فرماتے ہیں:

مقتضى الامر بلزوم الجماعة انه يلزم المكلف متابعة مااجمع عليه المجتهدون۔[۲]	التزام جماعت کے حکم کا منشا یہ ہے کہ آدمی کو مجتہدین کے متفقہ فیصلہ کی اتباع کرنا لازمی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کو اس بات کی شکایت ہے کہ لوگ اجماع کا مفہوم سمجھے بغیر مجمع علیہ مسائل پر اجماع کا حکم صادر کر دیتے ہیں لیکن جب کسی مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اسے خود امام موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

معنى الاجماع ان يجتمع علماء المسلمين على حكم من الاحكام لم يكن لاحد ان يخرج عن اجماعهم فان الامة لاتجتمع على ضلالة۔[۳]	اجماع کا معنیٰ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اہل علم کسی حکم پر متفق ہو جائیں اور جب کسی حکم پر امت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ان کے اجماع سے باہر نکل جائے۔ کیوں کہ امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ جب اہل حل وعقد حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو آپ نے اسے پوری امت کی بیعت کے ہم معنیٰ تصور کیا اور امیر معاویہؓ کے اختلاف کو باغیانہ اختلاف سمجھ کر ان سے جنگ کی۔ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے: لاخلافة الا عن مشورة۔[۴] (خلافت مشورہ کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتی۔) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک مرتبہ فرمایا: تین باتیں ہیں، جنہیں ذہن نشین کر لو۔ ان میں سے ایک ہے: الامارة شوریٰ۔[۵] امارت

۱۔ فتح الباری: ج ۱۳، ص ۲۴۵ ۲۔ ایضاً ۳۔ فتاویٰ ابن تیمیہ: ج ۱، ص ۴۰۶

۴۔ کنز العمال: ج ۳، ص ۱۳۹ ۵۔ کنز العمال: ج ۳، ص ۱۵۸

شوریٰ کے ذریعہ طے پائے گی۔

حضرت عمرؓ اپنے ایک طویل خطاب میں فرماتے ہیں: ''اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ہاتھ پر مسلمانوں کے مشورے کے بغیر بیعت کرے گا تو نہ اس کی بیعت کا کوئی اعتبار کیا جائے گا اور نہ اس شخص کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، جس کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ ہاں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں دونوں کی گردنیں نہ اڑا دی جائیں۔[۱]

حضرت عمرؓ ہی کا ایک قول ہے:

من دعا الی امارة نفسه او غیره من غیر مشورة فلایحل لکم ان لاتقتلوه۔[۲]

جو شخص اہل حل وعقد کے مشورہ کے بغیر خود امیر بننے یا دوسرے کو امیر بنانے کی دعوت دے تو تمہیں لامحالہ اسے قتل کر دینا چاہیے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے خلافت کے معاملہ کو جن چھ اشخاص کی کمیٹی کے حوالہ کیا تھا کہ باہم مشورے سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں، اس کمیٹی سے خطاب کر کے فرماتے ہیں:

فمن تأمر منکم علی غیر مشورة من المسلمین فاضربوا عنقه۔[۳]

تم میں سے جو شخص مسلمانوں سے مشورے کے بغیر امیر بن جائے تو اس کی گردن قلم کر دو۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلافت کی پیش کش کی تو آپ نے جواب دیا، یہ کام رواروی اور جلد بازی میں کرنے کا نہیں ہے، حضرت عمرؓ کی متعین کردہ شوریٰ موجود ہے، وہ باہم مشورہ سے کسی کو امیر منتخب کرے گی۔[۴]

ابن قتیبہ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ اور زیادہ صاف اور واضح ہیں:

۱۔ بخاری: باب رجم الحبلیٰ من الزنا ان احصنت، مسند احمد حدیث نمبر ۳۹۱

۲۔ کنز العمال: ج ۳، ص ۱۶۷

۳۔ طبقات ابن سعد القسم الاول: ج ۳، ص ۲۴۹۔۲۵۰

۴۔ طبری: ج ۵، ص ۱۵۶

لیس ذالک الیکم انما ھو لاھل الشوریٰ واھل بدرٍ فمن رضی به اھل الشوریٰ واھل بدرٍ فھو الخلیفة فنجتمع وننظر فی ھذا الامر۔[۱]

انتخاب امیر تمہارا کام نہیں۔ یہ اہل شوریٰ اور اہل بدر کا حق ہے جس شخص پر اہل شوریٰ اور اہل بدر متفق ہوجائیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔

اس وقت حضرت زبیرؓ نے جو تقریر کی ہے اسے ابن قتیبہ نے ان الفاظ میں محفوظ کیا ہے:

ان اللہ قد رضی لکم الشوریٰ فاذھب به الھویٰ وقد تشاورنا ورضینا علیاً فبایعوہ۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نظام شوریٰ پسند کیا ہے۔ جس کے بعد کسی شخص کو اپنی خواہشات کی پیروی کا موقع نہیں رہا۔ ہم امامت کے معاملہ پر مشورہ کے بعد حضرت علیؓ پر متفق ہوگئے ہیں۔ لہٰذا تم بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔

ان تصریحات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امت کے اس اعلیٰ طبقہ کا اقتدار کتنا وسیع اور قوی ہے۔ شیخ محمد خضری لکھتے ہیں:

"شاورھم فی الامر، کا خطاب پوری امت سے ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے تمام اہم کاموں کی اساس شوریٰ ہی ہے۔ ان میں اہم ترین کام خلیفہ کا

۱۔ الامامۃ والسیاسۃ :ص ۴۸

۲۔ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت طلحہؓ وزبیر کے ساتھ اس لیے جنگ کی تھی کہ اصحاب شوریٰ ان کے ہاتھ پر بیعت کرچکے تھے۔ (تفصیلات :اخبار الطوال۔ البدایہ والنہایۃ) حضرت معاویہؓ سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مہاجرین وانصار نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، بلکہ قاتلین عثمان نے کی ہے۔ اگر آپ کا ان سے تعلق نہیں ہے تو انہیں ہمارے حوالے کردیں۔ ہم ان سے بدلہ لیں گے اور پھر مشورے سے امیر کا انتخاب ہوگا۔ حضرت علیؓ نے اس ناروا مطالبہ کو قبول نہیں کیا اور جنگ صفین ہوئی۔ اس کی تفصیل تاریخ طبری میں دیکھی جاسکتی ہے۔

انتخاب ہے جو بغیر مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رضامندی کے عمل میں نہیں آسکتا۔ 'شوریٰ' اہلِ حل وعقد کا دوسرا نام ہے۔ جس میں کبارِ صحابہ رضوان اللہ علیہم شامل ہیں۔ جنہیں حضور اکرم ﷺ کے شرفِ صحبت کے بیش از بیش مواقع حاصل رہے۔ جنہیں نورِ بصیرت عطا کیا گیا اور جو جانتے تھے کہ امت کی صلاح وفلاح کس کے انتخاب میں ہے۔"[۱]

حضرت عمرؓ جب خلافت کو اپنے بعد چھ افراد کے حوالے کر چکے تو مشہور صحابی حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کو بلا کر کہا کہ تم اپنی قوم کے پچاس آدمیوں کو لے کر ان چھ افراد کو تین دن کے اندر اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرنے پر مجبور کردو اور تین دن سے پہلے خلیفہ منتخب کیے بغیر انہیں چھوڑو نہیں۔[۲]

عراق کی مہم میں جس وقت حضرت ابوعبید ثقفیؓ شہید ہو گئے تو سپاہ سالاری کا سوال پیدا ہوا۔ مسئلہ اہم تھا۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ کچھ بزرگوں نے خود حضرت عمرؓ ہی کو کمانڈر بن جانے کا مشورہ دیا، لیکن اکثریت اس کے خلاف تھی۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ مسئلہ شوریٰ اور اہلِ حل وعقد کی حیثیت پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

یحق للمسلمین وامرھم شوریٰ بینھم و انی انما کنت کرجل منکم حتی صرفنی ذوی الرأی منکم عن الخروج فقد رأیت ان اقیم وان ابعث رجلاً۔[۳]

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے معاملات شوریٰ کے ذریعہ طے پائیں۔ میں تمہیں جیسا ایک فرد ہوں جب تمہارے اصحابِ رائے نے مجھے میدانِ جنگ میں جانے سے روک دیا ہے تو میری یہی رائے قرار پائی کہ مدینہ میں مقیم رہوں اور کسی دوسرے آدمی کو مہم پر بھیجوں۔

۱۔ اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء، ص ۱۲

۲۔ طبقات ابن سعد: ج ۳، ص ۴۲

۳۔ الفاروق ہیکل: ج ۲، ص ۲۰۹

اسی وجہ سے علماء امت نے شوریٰ کو دین کی ایک اہم بنیاد اور غیر متبدل اصول کی حیثیت دی ہے اور جو امیر اس اصلِ اساسی کو منہدم کر دے تو اسے اپنے منصب سے ہٹا دیا جائے گا۔ ابن عطیہؒ کہتے ہیں:

والشوریٰ من قواعد الشریعة وعزائم الاحکام من لا یستشیر اهل العلم والدین فعزله واجب هذا مالاخلاف فیه۔[۱]	حکم شوریٰ اساساتِ دین اور قطعی احکام میں سے ایک ہے جو حاکم اہلِ علم و دین سے مشورہ نہیں کرتا اس کا معزول کر دینا واجب ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں پایا جاتا۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ جنین کی دیت کے سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کیا تھا۔ اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے آٹھویں صدی کے بلند پایہ محدث علامہ ابن دقیق العبدؒ لکھتے ہیں:

واستشارة عمر فی ذالک اصل فی الاستشارة فی الاحکام اذالم تکن معلومة للامام۔[۲]	حضرت عمرؓ کا اس معاملہ میں مشورہ کرنا ایک اصولی حیثیت رکھتا ہے، جب کہ احکامِ شریعت امام کو معلوم نہ ہوں۔

علامہ رشید رضا مرحوم نے اس پہلو کو زیادہ واضح الفاظ میں پیش کیا ہے۔

والظاهر ان طاعتهم تجب علی الحکومة وافراد الامة اذاهم اجمعوا وانه یجب علی الحاکم والمحکوم رد المسائل العامة والمتنازع فیها الیهم سواء اجتمعوا بانفسهم او بطلب الامة او بطلب الحکومة بشرط ان یکونوا اهم هم۔[۳]	واضح بات تو یہ ہے کہ 'اولوالامر' کی اطاعت حکومت اور افراد امت دونوں پر واجب ہے۔ جب وہ کسی بات پر متفق ہو جائیں اور امیر مملکت اور افراد امت پر واجب ہے کہ وہ مختلف فیہ امور اور عام مسائل میں ان کی طرف رجوع کریں۔ یہ اولوالامر خواہ از خود جمع ہو گئے ہوں یا امت کے طلب کرنے یا حکومت کی طلب سے مجتمع ہو گئے ہوں۔ بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں اہلِ حل و عقد ہوں۔

اس سے انتخاب خلیفہ اور دیگر بنیادی امور میں شوریٰ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی اقدام معتبر نہ ہوگا۔

۱۔ تفسیر قرطبی: ج ۴، ص ۹۵ ۲۔ احکام الاحکام: ۴، ص ۹۸

۳۔ تفسیر المنار: ج ۵، ص ۲۰۰

علمِ نجوم کی حقیقت

ـــــــــــــــ ڈاکٹر غلام قادر لون

اجرامِ فلکی کے علم کو 'علم فلکیات' کہتے ہیں۔ ماہ و سال کے کلینڈر اسی علم کی بنیاد پر تیار ہوتے ہیں، جن سے عبادت کے اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ موسموں کے تغیرّ و تبدّل سے واقفیت ہوتی ہے۔ زراعت، تجارت اور کام کاج میں نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور دوسرے سماجی رسوم کے لیے تاریخیں مقرر کی جاتی ہیں۔ گویا سارا کاروبارِ حیات اسی کلینڈر یا تقویم کی مدد سے چلتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاء وَالْقَمَرَ نُوراً وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ
لِتَعْلَمُواْ عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَاب (یونس:۵)

''وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منوّر بنایا اور چاند کی منزلیں
مقرر کیں، تاکہ برسوں کا شمار اور (کاموں کا) حساب معلوم کرو۔''

علم فلکیات یا علمِ نجوم کے اس پہلو کا تعلق سائنس سے ہے، اس لیے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر ستاروں کے بارے میں ہزاروں سال سے یہ خیال عام رہا ہے کہ انسانوں کی تقدیر، خوش بختی، بدبختی اور زندگی کے معاملات میں کام یابی اور ناکامی ستاروں سے وابستہ ہوتی ہے اور وہی انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس خیال کی بنا پر بچے کی پیدائش پر بڑے اہتمام سے زائچے تیار کروائے جاتے ہیں، جس میں بچے کی آئندہ کی زندگی میں آنے والے مبارک یا منحوس ماہ و سال، ایام و اوقات اور حرکات و سکنات کے بارے میں مبہم و غیر مبہم اشارے ہوتے ہیں، جنہیں عام لوگ پیش گوئیاں سمجھتے ہیں۔ یہی وہ خیال ہے جس کی بنیاد پر اب لڑکے لڑکیوں کے رشتے طے کیے جاتے ہیں، یا طے شدہ رشتے قطع کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی

خیال کی بنا پر آج نجومیوں کا کاروبار زور شور سے چل رہا ہے، جب کہ اکثر کاروبار ٹھپ ہو رہے ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک شادی، ملازمت، تجارت اور زندگی کی دوسری سرگرمیوں پر نجومی بلا شرکت غیرے چھائے ہوئے ہیں، کیوں کہ ان کے بارے میں عام تأثر یہ ہے کہ وہ ستاروں کا علم رکھتے ہیں۔

نجومی کو منجّم، ستارہ داں اور اختر شناس بھی کہا جاتا ہے۔ عرب کاہن اور عرّاف کو بھی نجومی سمجھتے تھے۔ ذیل میں یہ جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علم نجوم کے بارے میں قرآن وسنت سے کیا رہ نمائی ملتی ہے۔ قرآن مجید میں اجرامِ فلکی کے بارے میں جو آیات آئی ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ (الصّٰفّٰت:٦)

''بے شک ہم نے ہی آسمانِ دنیا کو ستاروں سے مزین کیا ہے۔''

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (الملک:٥)

''اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی۔''

یعنی ستارے آسمان کے چراغ ہیں، جن سے خالقِ کائنات نے آسمان کو سجایا۔ ستارے آسمان کے لیے رونق کا باعث ہیں۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجاً وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ. إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ (الحجر:١٦-١٨)

''اور ہم نے ہی آسمان میں بُرج بنائے اور دیکھنے والوں کے لیے اس کو سجا دیا اور ہر شیطان راندۂ درگاہ سے اسے محفوظ کر دیا۔ ہاں اگر کوئی چوری سے سننا چاہے تو چمکتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لپکتا ہے۔''

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ. وَحِفْظاً مِّن كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ. لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَى وَيُقْذَفُونَ مِن كُلِّ جَانِبٍ. دُحُوراً وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ. إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ

فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (الصّٰفّٰت: ۶-۱۰)

''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا اور ہر شیطانِ سرکش سے اس کی حفاظت کی کہ اوپر کی مجلس کی طرف کان نہ لگا سکیں اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں، (یعنی وہاں سے) نکال دینے کو اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ ہاں جو کوئی (فرشتوں کی کسی بات کو) چوری چھپے جھپٹ لینا چاہتا ہے تو جلتا ہوا انگارہ ان کے پیچھے لگتا ہے۔''

اس کا اعتراف جنوں نے بھی کیا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ جن کہتے ہیں:

وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا. وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (الجن: ۸-۹)

''اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اس کو مضبوط چوکی داروں اور انگاروں سے بھرا ہوا پایا اور یہ کہ پہلے ہم وہاں بہت سے مقامات میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ اب کوئی سننا چاہے تو اپنے لیے انگارہ تیار پاتا ہے۔''

اللہ کا حکم سننے کے لیے فرشتے کھڑے ہوتے ہیں۔ جب فرشتے آپس میں بات کرتے ہیں تو جن/ شیاطین کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے ہیں، جس پر انھیں ستاروں سے مار کر بھگایا جاتا ہے۔ تاہم وہ کبھی فرشتوں کی کوئی بات لے اُڑتے ہیں، پھر وہ اس میں سو جھوٹ ملا دیتے ہیں اور کاہن کو بتا دیتے ہیں۔ فرشتوں سے چُرائی ہوئی سچی بات جب کاہن کو معلوم ہوتی ہے تو کاہن اس میں اپنی طرف سے بھی جھوٹ ملا دیتا ہے۔ کاہن کی بتائی ہوئی باتوں میں سے جب کوئی بات سچ نکلتی ہے تو وہ فرشتوں سے چوری چھپے سنی ہوئی بات ہوتی ہے۔ پھر لوگ کاہن کی جھوٹی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھیے کاہن نے فلاں بات بتائی اور وہ سچ نکلی۔[۱]

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِىْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ

وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُون (الانعام:۹۷)

''اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تا کہ خشکی (صحراؤں، جنگلوں) اور سمندروں کی تاریکیوں میں ان سے رستے معلوم کرو۔''

وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (النحل:۱۶)

''اور راستوں میں نشانات بنائے اور لوگ ستاروں سے بھی راستے معلوم کرتے ہیں۔''

ان آیات میں ستاروں کے تین مقاصد بیان ہوئے ہیں:

۱۔ ستارے آسمان دنیا کی زینت ہیں۔

۲۔ ستاروں سے ان شیاطین کو مار کر بھگایا جاتا ہے جو کان لگا کر عالمِ بالا کی باتوں کو سننے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ ستاروں سے خشکی اور سمندروں کے اندھیروں میں سمت اور راستہ معلوم ہوتا ہے۔

احادیثِ نبوی میں بھی نجوم کے بارے میں رہ نمائی ملتی ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں ایک صبح نماز پڑھائی۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''جانتے ہو کہ تمارے رب نے کیا فرمایا ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''رب نے ارشاد فرمایا ہے: آج میرے بندوں میں سے دو طرح کے بندوں نے صبح کی، جن میں سے بعض مومن تھے اور بعض کافر۔ جس نے یہ کہا کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی، وہ مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہوا اور جس نے یہ کہا کہ فلاں فلاں تارے سے بارش ہوئی، اس نے میرا انکار کیا اور تاروں پر ایمان لایا۔''[۲]

دورِ جاہلیت میں عرب طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ وہ اپنے حسب و نسب پر فخر کرتے تھے اور دوسروں کے حسب و نسب میں خامی نکال کر طعنہ دیتے تھے۔

بارش ستاروں سے طلب کرتے تھے اور اپنے اعزا و اقارب میں کسی کی موت پر نوحہ کرتے تھے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے: ''چار چیزیں میری اُمت میں جاہلیت کی ہیں، جنہیں وہ ترک نہیں کریں گے: حسب ونسب پر فخر کرنا، حسب ونسب میں طعن کرنا، ستاروں سے بارش طلب کرنا اور مرنے پر نوحہ کرنا۔'' بعض احادیث میں 'ایماناً بالنجوم' (ستاروں پر ایمان) کے الفاظ آئے ہیں۔

احادیث میں علمِ نجوم سیکھنے کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے علمِ نجوم کا کچھ حصہ حاصل کیا، اس نے جادو کا حصہ حاصل کیا۔ جتنا زیادہ وہ علم نجوم حاصل کرے، اتنا ہی زیادہ جادو حاصل کیا۔''[۴]

عہدِ جاہلیت میں عرب غیبی امور معلوم کرنے لیے کاہن یا عرّاف کے پاس جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو کاہنوں کے پاس جانے سے منع کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

''جو کسی عرّاف کے پاس گیا اور اس سے کسی چیز کے متعلق پوچھا تو اس کی چالیس روز کی نماز قبول نہیں ہوگی۔''[۵]

'عراف' اس شخص کو کہتے ہیں جو علمِ نجوم، کہانت یا علم رمل وغیرہ کے ذریعے غیبی امور معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص کسی کاہن یا عرّاف کے پاس جائے اور جو وہ کہے اس کو سچ جانے، اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔''[۶]

حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد ہے:

''علم نجوم بس اتنا سیکھو کہ تمہیں خشکی اور سمندر میں راستہ معلوم ہو، اس سے زیادہ مت سیکھو۔''[۷]

مشہور تابعی حضرت قتادہؒ (م ۱۱۸ھ) کہتے ہیں:

''ان ستاروں کو تین مقاصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے: اللہ نے انھیں

آسمان کی زینت کے لیے بنایا ہے، شیاطین کو مار بھگانے کے لیے بنایا ہے اور انھیں راستہ معلوم کرنے کے لیے نشانیاں بنایا ہے۔ لہٰذا جو شخص ان کے بارے میں اس کے بغیر کچھ اور کہے تو اس نے غلطی کی، اپنا نصیب تباہ کر دیا اور جس چیز کا اسے علم نہ تھا، اسے معلوم کرنے میں تکلف کیا۔''[۸]

علمائے اسلام میں امام ابن حزمؒ (م ۴۵۶ھ) ستاروں کے تاثیر کے منکر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ستاروں کا کوئی اختیار ہوتا تو ایک ہی دائرے میں حرکت نہ کرتے۔[۹] امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ انھوں نے علمِ نجوم سیکھنے کی ممانعت تین وجوہ سے کی ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں کے عقائد خراب ہوتے ہیں اور وہ ستاروں کو مؤثرِ حقیقی سمجھتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نجومی کے احکام اور اس کی پیشین گوئیاں محض اندازوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر ضروری اور بے فائدہ علم ہے۔ ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔[۱۰]

شمس و قمر اور دوسرے اجرامِ فلکی سے انسان کا تعلق شروع سے رہا ہے۔ سورج اور چاند کی گردش سے شمسی اور قمری سالوں کا حساب ہوتا ہے۔ چاند ہی کے سبب سمندر میں مدّ و جزر ہوتا ہے۔ سورج چاند اور ستارے آسمان پر ہیں۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے دلوں میں ان کی عظمت مزید راسخ ہو جاتی ہے۔ ستاروں کے بارے میں جب یہ خیال عام ہوا کہ ان سے قسمت کا تعلق ہوتا ہے اور انھی سے انسان کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے تو انھیں مؤثرِ حقیقی مان لیا گیا، حتیٰ کہ بعض قوموں نے غلط عقائد کی وجہ سے انھیں معبود بنایا، جس سے دنیا میں آفتاب پرستی اور کواکب پرستی رائج ہو گئی۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کی قوم ستاروں کو پوجتی تھی اور انھیں مؤثر مانتی تھی۔ ملکۂ سبا بلقیس کی قوم سورج کو سجدہ کرتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اجرامِ سماوی کی عبادت سے انسانوں کو منع کیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمِنْ آيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا

لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (حم السجدہ: ۳۷)

''اور رات اور دن اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تم لوگ نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، بلکہ اللہ ہی کو سجدہ کرو، جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے، اگر تم کو اس کی عبادت منظور ہے۔''

سورج، چاند اور ستارے اللہ کی مخلوق ہیں۔ وہ خود کسی قسم کا اختیار نہیں رکھتے۔ یہ سب اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف: ۵۴)

''اور اسی نے سورج چاند اور ستاروں کو پیدا کیا سب اسی کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں، دیکھو ساری مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (النحل: ۱۲)

''اور اسی نے تمھارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا اور ستارے بھی اسی کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ سمجھنے والوں کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔''

ان آیاتِ کریمہ میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ سورج، چاند اور ستارے اللہ کے حکم سے مسخر ہیں اور اسی کی حکم برداری میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اچھے خاصے دین دار لوگ کسی نہ کسی صورت میں ستاروں کی تاثیر کے قائل ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کا انکار کرتے ہیں وہ بھی ستاروں کے معتقد ہوتے ہیں۔

علمائے اسلام نے علمِ نجوم کو غیر شرعی اور اور فضول علم کہا ہے۔ ستاروں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ ان کی تاثیر سے قسمت بنتی اور بگڑتی ہے، شرک ہے۔ علماء

نے دنیاوی معاملات میں ستاروں سے مدد لینے کی ممانعت کی ہے۔ امام غزالیؒ نے قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پس یہ نہ سمجھا جائے کہ سورج اور چاند کے حساب کے مطابق منظم اور مرتّب گردش اور سایہ، روشنی اور ستاروں کی پیدائش کا مطلب یہ ہے کہ ان سے دنیاوی امور میں مدد لی جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان سے اوقات کا اندازہ لگایا جاسکے، تاکہ ان میں عبادات ہوسکیں اور آخرت کی تجارت کی جاسکے۔''[۱۱]

جلال الدین رومیؒ (م۶۷۲ھ) کہتے ہیں کہ انسان کی ہمیشہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کا ستارہ ہمیشہ 'سعد' رہے۔ وہ اس کی نحوست سے گھبراتا ہے، مگر انسان کو ستاروں کی گردش نہیں دیکھنی چاہیے، بلکہ اسے اس ذات سے عشق کرنا چاہیے جو ان ستاروں کو گردش دے رہی ہے۔

تو مبیں قلابی ایں اختراں
عشق خود بر قلب زن بیں اے فلاں[۱۲]

(تو ان ستاروں کی گردش کو مت دیکھ، بلکہ گردش دینے والے کے ساتھ اپنے عشق پر نظر کر۔)

شیخ محمود شبستریؒ (م۷۲۰ھ) 'سعادت نامہ' میں نجومیوں پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی تقدیر نجومیوں کے احاطے سے باہر ہیں۔ نجومیوں کی زیج تقدیرِ الٰہی کا احاطہ نہیں کرسکتی۔

حاصل تو کنوں ز علم نجوم
بخت بد بودو طالع شوم
در جہاں ہر کجا فلک زدہ ایست
دو رپی گفتگوی ہیدہ ایست
ہوسش از علم تنجیم است
میل طبعش بہ زیج و تقویم است

ای موحد از آں بگرو داں روی
وحہ لاشریک لہ می گوی ۱۳

(یعنی علم نجوم سے تو بدبختی اور منحوس طالع کے بھنور میں پڑا رہتا ہے۔ آسمان کا مارا ہوا بے چارہ بے ہودہ گفتگو کرتا رہتا ہے۔ وہ علمِ نجوم حاصل کرنے کا حریص ہوتا ہے اور اس کا طبعی میلان زیج اور جنتری کی طرف ہوتا ہے۔ اے موحد! ان سے اپنا منھ پھیر لے۔ وحدہ لاشریک لہ پڑھا کر۔)

شیخ محمود شبستریؒ نے اپنی مشہور تصنیف 'گلشن زار' میں ستاروں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اجرامِ فلکی یوں ہی پیدا نہیں کیے ہیں۔ جب مچھر پیدا کرنے میں حکمت ہوگی تو عطارد اور مریخ کی تخلیق میں حکمت کیوں نہیں ہوگی۔ بحث کے خاتمے پر کہتے ہیں:

ولی چوں ہنگری دراصل ایں
کار فلک را بینی اندر حکم جہاد
نجم چوں زایمان بی نصیب است
اثر گو ید کہ شکل غریب
نمی بنید کہ ایں چرخ مدور
ز حکم و امرحق گشتہ مسخر ۱۴

(مگر جب تم اس کی اصل پر جاؤ گے تو آسمان کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت پاؤ گے۔ نجومی چوں کہ ایمان سے بے بہرہ ہوتا ہے، اس لیے کہتا ہے کہ یہ ستاروں کی تاثیر سے ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ گول آسمان حق تعالیٰ کے حکم اور امر سے مسخر ہو گیا ہے۔)

امام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) ستاروں کے تاثیر کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے نجومیوں کو گم راہ قرار دے کر ان کے افکارِ باطلہ کی تردید کی ہے۔ انہوں نے

مشہور مفسر امام رازیؒ (م ۶۰۶ھ) پر بھی تنقید کی ہے کہ ان کی بعض تصنیفات سے عام لوگ ستاروں کی تاثیر کے قائل ہو گئے تھے۔ ۱۵

مشہور بزرگ شیخ علاؤ الدین سمنانیؒ (م ۷۳۶ھ) نے اپنی تصنیف 'العروہ' میں افلاک و کواکب پر بھی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ستاروں سے بارش ہوتی ہے اور بغیر حکم خدا کے اپنے اختیار سے بارش بھیجتے ہیں وہ کافر ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر ستاروں کو امر حق کا حکم بردار جانے تو وہ کافر اور بدعتی نہیں ہوگا۔ ۱۶

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ (م ۷۸۶ھ) نے امام غزالیؒ کی رائے دہراتے ہوئے قرآن حکیم کی آیت وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (الرحمٰن: ۵) "اور سورج اور چاند ایک حساب سے (گردش میں) ہیں۔" درج کی ہے، پھر لکھا ہے:

> "کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ یہ دو مرتبے ہیں، جن سے دنیا کے معاملات میں مدد لی جاسکتی ہے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ ان سے طاعات اور ذکر اللہ کے اشغال کے لیے اوقات کا اندازہ لگایا جاسکے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا (الفرقان: ۶۲) "وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا، ہر اس شخص کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے، یا شکر گزار ہونا چاہے۔" ۱۷

امام کمال الدین الدمیریؒ (م ۸۰۸ھ) علم نجوم کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کا سیکھنا اور اسے حاصل کرنا برا سمجھا گیا ہے۔ انھوں نے احادیثِ رسول اور حضرت عمرؓ کا وہ قول بھی نقل کیا ہے، جو اوپر گزر چکا۔ انہوں نے امام غزالیؒ کی 'احیاء علوم الدین' کی عبارت بھی درج کی ہے۔ ۱۸

حضرت مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے دور میں دم دار ستارہ نمو دار ہوا تھا۔ اس سے پہلے مشرق کی طرف سے ایک نورانی ستون بھی ظاہر ہوا تھا۔ حضرت سے اس معاملے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب میں ایک مکتوب تحریر کیا، جس میں انھوں نے لکھا تھا:

''اور وہ نورانی ستون، جو دم دار ستارے کے ظہور سے پہلے طلوع ہوا تھا، اس میں کوئی ظلمت و کدورت معلوم نہیں ہوتی اور خیر و برکت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں دم دار ستارہ میں کدورت کا شائبہ نہیں ہے۔ نافع اور ضارّ صرف اللہ ہے۔ کسی ستارے میں کسی آدمی کی موت یا کسی کی زندگی ودیعت نہیں کی گئی ہے۔ جو کچھ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ستاروں کے مقاصد تین ہیں: اللہ فرماتا ہے: (النحل) ''وہ خشکی اور سمندر کے سفر میں راہ پاتے ہیں۔'' اور فرمایا ہے: ''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو مزیّن کیا ہے اور انھیں شیطانوں کے رجم کا سبب بنایا ہے۔'' (الملک)، یعنی دوسرا مقصد آسمانِ دنیا کو مزیّن کرنا ہے اور تیسرا مقصد شیطانوں کو ان سے رجم کرنا ہے، تاکہ وہ چھپ کر باتیں نہ سن سکیں۔ ان تین کے علاوہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں اور وہ اوہام و خیالات میں داخل ہے۔ یقیناً ظن حق سے کچھ بھی کفایت نہیں کرتا، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ بعض ظن گناہ ہیں۔'' [19]

حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ) کا بیان ہے کہ علم نجوم کا اطلاق تین قسموں پر ہوتا ہے: حسابیات، طبیعیات اور وہمیات۔ حسابیات تو یقینی علم ہے۔ اس میں شرعاً ممانعت نہیں ہے۔ طبیعیات میں فلکی بروج میں سورج کے داخل ہونے سے گرمی اور سردی کا موسم اور دن رات برابر ہونے کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ یہ بھی شرعاً بُرا نہیں ہے۔ وہمیات میں دنیا میں ہونے والے واقعات پر ستاروں کی گردش کے تاثیر سے استدلال کیا جاتا ہے۔ چوں کہ شریعت میں اس کی کوئی سند نہیں، اس لیے یہ ممنوع ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب ستاروں کا ذکر آئے تو خاموش رہو۔ [20]

مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) نے 'تقویۃ الایمان' میں حضرت زید بن خالد الجہنیؓ کی حدیبیہ والی حدیث، جو اوپر نقل کی گئی ہے، درج کر کے لکھا ہے:

''یعنی جو شخص کائنات میں مخلوق کی تاثیر سمجھتا ہے، اسے حق تعالیٰ اپنے منکروں میں شمار فرماتا ہے کہ وہ ستارہ پرست ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ

سارا کارخانہ اللہ کے حکم سے چل رہا ہے وہ اس کا مقبول بندہ ہے، ستارہ پرست نہیں۔ معلوم ہوا کہ نیک و بد ساعتوں کے ماننے، اچھی بری تاریخوں یا دن کے پوچھنے اور نجومی کی بات پر یقین کرنے سے شرک کا دَر کھلتا ہے، کیوں کہ ان سب کا تعلق نجوم سے ہے اور نجوم کا ماننا ستارہ پرستوں کا کام ہے۔''[۲۱]

مولانا نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث بھی نقل کی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے علم نجوم کا کوئی مسئلہ سیکھا، بغیر ایسی صورت کے جو اللہ نے بیان کی ہے تو اس نے جادو کا ایک حصہ سیکھا۔ نجومی کاہن ہے اور کاہن جادوگر ہے اور جادوگر کافر ہے۔''[۲۲]

بعض اوقات نجومی کی پیش گوئیاں سچ بھی نکلتی ہے، مگر اس سے انسان کا عقیدہ متأثر نہیں ہونا چاہیے۔ نجومی اٹکل پچو اور قیاس و گمان سے کام لیتا ہے، جو کبھی ٹھیک نکلتا ہے، مگر ان گنت واقعات ایسے ہیں جن میں نجومی کی پیش گوئیاں غلط نکلی ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے جب خوارج کے خلاف جنگ کا ارادہ کیا تو ایک نجومی نے ان سے کہا: اگر آپ اس وقت نکلے تو علم نجوم کی بنا پر مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کام یاب نہیں ہوں گے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا:

''کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اس گھڑی کا پتہ دیتے ہو جس میں اگر کوئی نکلے تو اس میں اس کے لیے کوئی برائی نہیں ہوگی اور اس گھڑی سے ڈراتے ہو کہ اگر کوئی اس میں نکلے تو اسے نقصان ہوگا۔ جس نے اسے صحیح مانا اس نے قرآن کو جھٹلایا اور پسند کو پالینے اور ناپسند کو دور کرنے میں وہ اللہ سے مدد مانگنے سے بے نیاز ہوگیا۔ تم اپنی بات سے چاہتے ہو کہ وہ جو تمہارے کہے پر عمل کرے وہ اللہ کو چھوڑ کر تمہارا شکر کرے، کیوں کہ تم نے اپنے خیال میں اسے وہ گھڑی بتائی جس میں اسے فائدہ ہوا اور وہ نقصان سے بچ گیا۔''[۲۳]

اس کے بعد حضرت علیؓ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''لوگو! نجوم کے سیکھنے سے پرہیز کرو، سوائے اس کے جس سے تم خشکی اور تری میں راستے معلوم کرسکو۔ کیوں کہ نجوم کا سیکھنا کہانت کی طرف لے جاتا ہے نجومی کاہن کی مانند ہے، کاہن ساحر کی طرح ہے اور ساحر کافر کی مانند ہے اور کافر کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اللہ کا نام لے کر کوچ کرو۔'' ۲۴

نجومی کے مشورے کو نظر انداز کر کے حضرت علیؓ نے فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ نہروان کی یہ جنگ خوارج کے خلاف لڑی گئی۔ خوارج کے چار ہزار جنگجوؤں میں سے صرف نو بچ گئے۔ انہیں بڑی شکست ہوئی۔ حضرت علیؓ کی فوج میں سے صرف سات افراد میدان جنگ میں کام آئے اور نجومی کی پیش گوئی کے برعکس حضرت علیؓ فتح یاب ہوئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک دفعہ سفر پر نکلے تو آپ سے کہا گیا: ''چاند کیسی خوب صورتی سے چمک رہا ہے۔'' کہنے والے کا مقصد یہ تھا کہ چاند اس وقت دبران میں ہے اور یہ وقت سفر کے لیے موزوں نہیں ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے چاند کی طرف دیکھا اور کہنے والے کا مقصد بھانپ گئے۔ انھوں نے اس شخص سے کہا: تمہاری مراد یہ ہے کہ چاند دبران میں ہے (اور مجھے اس وقت سفر نہیں کرنا چاہیے)۔ سنو: ''ہم سورج اور چاند پر بھروسہ کر کے نہیں نکلتے، بلکہ اللہ واحد وقہار پر توکّل کر کے نکلتے ہیں۔'' ۲۵

خلیفہ معتصم باللہ (م ۲۲۷ھ) کے عہدِ خلافت میں رومیوں نے مسلمانوں کے علاقے میں گھس کر لوٹ مار کی، وہاں کے مردوں کو قتل کیا اور عورتوں اور مردوں کو قیدی بنا کر لے گئے۔ قیدیوں میں ایک عورت کی زبان سے 'وامعتصماہ' کے الفاظ نکلے۔ رومیوں کی غارت گری اور ظلم و جبر کی خبر معتصم کو اس وقت پہنچی جب وہ مجلس میں عیش و طرب میں تھا۔ اسے جب عورت کے الفاظ سنائے گئے تو وہ اسی وقت بول پڑا: لبیک لبیک (میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں) اس کے بعد وہ کھڑا ہوا اور محل ہی سے 'الرحیل، الرحیل' کی آواز لگائی، فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ جب فوج تیار ہوگئی تو اس نے قاضی اور گواہوں کو بلوا کر اپنی جائداد اور اپنی دولت کے بارے میں وصیت کردی۔ اس کے بعد وہ رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے فوج لے کر روانہ ہوا۔ روانگی کے وقت نجومیوں نے

کہا کہ یہ نحس ساعت ہے، جو کوچ کے لئے مناسب نہیں، مگر اس نے ان کا مشورہ نہیں مانا اور روانہ ہوگیا۔ جنگ میں رومیوں کو شکست ہوئی اور معتصم کو فتح ملی۔ اس مہم میں اس نے رومیوں کے اہم شہر عموریہ کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ مہم میں ابوتمّام (م ۲۳۱ھ) بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے خلیفہ کے دربار میں قصیدہ پڑھا، جس کے مطلع میں نجومیوں کی پیش گوئی کی طرف اشارہ تھا، یعنی تلوار نجومیوں کی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ سچی خبر دیتی ہے: السیفُ اصدق انباء من الکتب۔[۲۶]

فارسی زبان کے مشہور شاعر الوزی (م ۵۴۷ھ) علم نجوم کے ماہر تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ پیش گوئی کی کہ فلاں دن ایسا سخت طوفان آئے گا کہ مکانات تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ لوگوں نے خوف کے مارے تہہ خانے بنائے اور اس روز تہہ خانوں میں جا بیٹھے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس دن معمولی ہوا بھی نہ چلی، جس پر بادشاہ نے انھیں زجر و توبیخ کی۔ ایک شاعر نے قطعہ لکھ کر پیش گوئی کا مذاق اڑایا، جس کا آخری مصرعہ یہ ہے۔

یامُر سل الریاح تو دانی و الوزی[۲۷]

(ہواؤں کے بھیجنے والے رب! تو جانتا ہے اور الوزی جانتا ہے۔)

نجومیوں کی پیش گوئیوں پر اعتماد کر کے بعض اوقات عجیب و غریب صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً ایک جنگ میں پہلے دن مغلوں کی افواج نے اس لیے لڑنے سے احتراز کیا تھا کہ وہ دن یہودی تقویم کے مطابق جنگ کے لیے ناموزوں تھا۔[۲۸]

اِن اَن گنت واقعات اور روز مرّہ تجربات کی وجہ سے علمِ نجوم پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ مشہور فارسی شاعر عمر خیام (م ۵۲۶ھ) ریاضیات اور فلکیات کے امام تھے۔ وہ علم نجوم میں اچھی خاصی دست گاہ رکھتے تھے۔ علم نجوم میں مہارت رکھنے کے باوجود وہ اس علم میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ نظامی سمرقندی (م ۵۵۰ھ) کا بیان ہے کہ ۵۰۶ھ میں بلخ میں قیام کے دوران امام عمر سے میں نے سنا تھا کہ میری قبر اس جگہ ہوگی جہاں شمالی ہوا میری قبر پر گل افشانی کرے گی۔ ۵۳۰ھ میں جب میں نیشاپور پہنچا تو اس کی وفات کو چار برس ہو چکے تھے۔ مجھ پر ان کا حق تھا۔ جمعہ کے روز ایک شخص کو ساتھ لے کر ان کی

قبر کو زیارت کو گیا۔ وہ شخص مجھے حیرہ کے قبرستان لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک باغ کی دیوار کے قریب ان کی قبر ہے۔ باغ میں کھڑے امرود اور زرد آلو کے درختوں کی شاخیں اس باغ سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور پھولوں کی اس قدر پنکھڑیاں ان کی قبر پر پڑی تھیں کہ وہ بالکل چھپ گئی تھی۔ مجھے بلخ میں ان سے سنے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔ میں نے دنیا میں کہیں بھی ان کی نظیر نہیں دیکھی۔ اگرچہ میں نے ان کا حکم دیکھا، مگر وہ احکامِ نجوم میں بالکل اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور نہ میں نے کسی بزرگ کو دیکھا یا سنا ہے کہ وہ احکام (علمِ نجوم) میں اعتقاد رکھتے تھے۔ ۲۹

خیام نے اپنی ایک رباعی میں کہا ہے۔

نیکی و بدی کہ در نہاد بشر ست
خیرے و شرے کہ در قضا و قدرست
با چرخ مکن حوالہ کو نیز خو تو
چرخ از تو ہزار بار بیچارہ ترست ۳۰

(اچھائی اور برائی انسان کے نہاد میں ہے۔ شادی اور غم تقدیر میں ہے۔ یہ چیزیں آسمان کے حوالے مت کرو، کیوں کہ آسمان تجھ سے بھی ہزار گنا لاچار ہے۔)

خیام کا یہی نکتہ علامہ اقبال (م ۱۳۵۷ھ) نے بھی بیان کیا ہے۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

نظامی سمرقندی نے خیامؔ کی ایک اور پیش گوئی کا ذکر کیا ہے، جو سچ نکلی تھی۔ مگر اس کے بعد لکھتے ہیں:

"علم نجوم اگرچہ مشہور فن ہے، مگر اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہم کو چاہیے کہ نجومی پر بھروسہ نہ کریں، بلکہ وہ جو حکم بھی لگائے اسے قضا کے حوالے کر دیں۔" ۳۱

حافظ شیرازی (م ۷۹۱ھ) کے دیوان سے فال نکالی جاتی ہے۔ علمِ نجوم کے بارے میں ان کی رائے بھی موافق نہیں ہے۔ وہ نجم سے نالاں ہیں کہ ان کا ستارہ کوئی نجومی نہ پہچان سکا۔

کوکب بخت مرا ہیچ منجم نہ شناخت
یارب از مادرِ گیتی بچہ طالع زادم

(میری قسمت کا ستارہ کوئی نجومی نہ پہچان سکا۔ اے رب! میں مادرِ گیتی سے کون سا طالع لے کر پیدا ہوا ہوں۔)

حافظ اپنی بربادی کا ذمہ دار طالع اور ستارہ کو نہیں مانتے، بلکہ کسی اور کو سمجھتے ہیں۔

از چشم خود بپرس کہ مارا کہ کشد
جاناں گناہِ طالع و جرمِ ستارہ نیست

(اپنی آنکھ سے پوچھ کہ ہمیں کون قتل کر رہا ہے؟ پیارے! طالع کا گناہ اور ستارے کا جرم نہیں ہے۔)

حافظ ہی نہیں، حساس لوگ عام طور پر نجومی کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ نجومی کی پیش گوئیاں اکثر غلط ثابت ہوتی ہیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی بات صحیح نکلتی ہے۔ اس لیے وہ بار بار نجومی سے 'پھر سے دیکھ لیجیے' کی تکرار کرتے رہتے ہیں۔ پروین شاکر نے ایسے ہی لوگوں کی زبانی یہ کہلوایا ہے۔

ستارہ داں مرا زائچہ دوبارہ دیکھ
تیرے کہے میں نہ آیا تو میرا سال آیا

غالبؔ کے زمانے کی دلّی کا حال یہ تھا کہ لوگ نیا لباس زیب تن کرتے تو پہلے نجومی سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ دلی کی سڑکوں پر نجومی اپنی پوتھیاں، جنم کنڈلیاں اور جنتریاں لیے لوگوں کو قسمتوں کا حال بتاتے تھے اور نو زائدہ بچوں کے زائچے تیار کرتے تھے، مگر غالبؔ، جو اپنی قسمت سے ہمیشہ نالاں رہتے تھے، نجومی سے کبھی متاثر نہ ہوئے۔ وہ تقدیر کے قلم کی جنبش کے قائل تھے۔

لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود
کسے خبر کہ وہاں جنبش قلم کیا ہے

علامہ اقبالؔ بھی ستاروں کے اثرات کے قائل نہیں ہیں۔ وہ نجم کی تقویم کو باطل سمجھتے ہیں اور انسان سے کہتے ہیں۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

نجومی اور اختر شناس کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ وہ دوسروں کی قسمت کا حال جانتا ہے، مگر اس کی اپنی قسمت اچھی نہیں ہوتی۔ اردو کے مشہور شاعر مومن خان مومن (م ۱۲۶۹ھ) اختر شناس بھی تھے۔ اس کے ذریعے جب وہ دوسروں کی اچھی قسمت دیکھتے تھے تو اپنی بدنصیبی پر اندر ہی اندر کڑھتے تھے۔ بدنصیب شاعر کو آسمان نے اختر شناسی کا علم دے کر گویا ستم ڈھانے کا نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ مومن کا شعر ہے۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

لہٰذا شرعاً اور عقلاً بہترین نکتہ یہ ہے کہ نجومی بننے سے پرہیز کیا جائے اور نجومی کے پاس جانے سے احتراز کیا جائے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

حواشی و مراجع:

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: صحیح بخاری، کتاب التفسیر : ۴۷۰۱، ۴۸۰۰، ۵۷۶۲، صحیح مسلم، کتاب السلام، ۲۲۲۹، سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، ۳۲۲۴، سنن ابن ماجہ، ۱۹۴

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، ۸۴۶، ۱۰۳۸، صحیح مسلم، کتاب الایمان، ۷۱، سنن ابی داوٗد، کتاب الطب، ۳۹۰۶

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، ۹۳۴

۴۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، ۳۷۲۶، سنن ابی داؤد، کتاب الطب، ۳۹۰۵
۵۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، ۲۲۳۰، مسند احمد، ۱۶۷۵۵، ۲۳۶۱۰
۶۔ مسند احمد، ۹۵۳۲۔ امام طبرانی نے 'المعجم الاوسط' (۱۴۷۶ میں یہ حدیث اس طرح نقل کی ہے: ''جو شخص کسی کاہن کے پاس آئے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے وہ اس چیز سے بری ہو گیا جو اللہ نے محمد ﷺ پر نازل کی ہے اور جو کاہن کے پاس آیا، مگر اس کی تصدیق نہیں کی تو اس کی چالیس دنوں کی نماز قبول نہیں ہوگی۔''
۷۔ ابو حامد محمد بن الغزالی، احیاء علوم الدین، بیروت لبنان، ۲۰۱۵، ص ۴۳
۸۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ۳
۹۔ ابن حزم، الفصل فی الملل والاھوء والنحل، بیروت، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۶، ۱۴۸/۵
۱۰۔ احیاء علوم الدین، ص ۴۳
۱۱۔ حوالہ سابق، ص ۴۱۱
۱۲۔ جلال الدین رومی، مثنوی مولانا روم، ترجمہ قاضی سجاد حسین، طبع دہلی، ذمر ششم، ص ۱۷۷
۱۳۔ شیخ محمود شبستری، سعادت نامہ، تہران، ص ۳۵
۱۴۔ شیخ محمود شبستری، گلشن راز، طبع اسلام آباد، لاہور، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸، ص ۱۵
۱۵۔ افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری، امام ابن تیمیہ، ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۹، ص ۲۰۴
۱۶۔ شیخ علاؤ الدین سمنانی، العروۃ لاہل الخلوہ والجلوۃ، تہران، ۱۳۲۶ھ ش/ ۱۴۰۴ھ، ص ۲۵۵
۱۷۔ میر سید علی ہمدانی، رسالہ اورادیہ، الباب الاول
۱۸۔ کمال الدین الدمیری، حیات الحیوان (اردو)، طبع لاہور، کراچی ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء، ۱/۸۰۔۸۲
۱۹۔ حضرت مجدد الف ثانی، مکتوب امام ربانی، طبع کراچی، ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء، دفتر دوم، مکتوب ۶۸، ص ۱۹۷
۲۰۔ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، بیروت، لبنان، طبع اول، ۲۰۰۸ء، ۴۶۳/۳
۲۱۔ مولانا اسماعیل شہید، تقویۃ الایمان، دیوبند، ۱۹۸۴ء، ص ۶۲
۲۲۔ حوالہ سابق، ص ۶۲
۲۳۔ نہج البلاغۃ، ص ۲۲۳
۲۴۔ حوالہ سابق

۲۵۔ ابو محمد عبداللہ بن عبدالحکم، بیروت، عمر بن عبدالعزیز، اردو ترجمہ: مولانا محمد یوسف لدھیانوی، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۹۶ء، ص ۲۶

۲۶۔ شیخ جلال الدین سیوطی، تاریخ الخلفاء، مطبع محمدی لاہور، ۱۳۰۴ھ، ص ۲۲۹۔ 'السیف اصدق انباء من الکتب'۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ابن الطقطقی کی تاریخ الفخری

۲۷۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، مطبع معارف، اعظم گڑھ، طبع ششم، ۱۹۷۲ء، ۲۳۴/۱، دولت شاہ سمرقندی، تذکرۃ الشعراء، لاہور، ۱۹۲۴ء، ص ۵۲

۲۸۔ ڈاکٹر محمد عمر، ہندستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، طبع نئی دہلی، بار دوم، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۴

۲۹۔ نظامی عروضی سمرقندی، چہار مقالہ، متن و اردو ترجمہ: ڈاکٹر حافظ شبیر احمد حیدری، نئی دہلی، طبع اول، ۲۰۰۷ء، ص ۸۷۔۹۷

۳۰۔ عمر خیام، رباعیات عمر خیام، مطبع منشی تیج کمار، لکھنؤ، بار دہم، ص ۱۲

۳۱۔ چہار مقالہ، ص ۹۷۔۸۰

وسیلہ کی شرعی حیثیت

پروفیسر محمد سلیم

وسیلہ کے معنی ہیں کسی چیز کے ذریعہ کسی ذات تک رسائی یا قرب حاصل کرنا۔ اس کی تین اقسام بالاتفاق جائز ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر صورتیں مختلف فیہ ہیں۔ قرآن وسنت میں جن تین اقسام کو جائز کہا گیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) اسماء حسنیٰ کا وسیلہ ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلِلّٰہِ الاَسمَاءُ الحُسنیٰ فَادعُوهُ بِهَا (الاعراف: ۱۸۵)

''اللہ کے بہت سے اچھے نام ہیں۔ تم اسے ان ناموں کے ذریعہ پکارو۔''

(۲) اپنے نیک اعمال کا وسیلہ: مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی فریاد نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلتَ وَاتَّبَعنَا الرَّسُولَ فَاكتُبنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ

(آل عمران: ۵۳)

''اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو آپ نے اتاری اور اتباع کیا آپ کے رسول کا۔ پس لکھ دے ہمیں شہادت دینے والوں میں۔''

اسی طرح ایک جگہ مؤمنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: اَلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغفِر لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّار (آل عمران: ۱۶) ''جو یہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم تجھ پر ایمان لائے تو بخش دے ہمارے گناہ اور بچا ہمیں جہنم کے عذاب سے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سے دعا کرتے وقت اپنے نیک اعمال کا واسطہ دینا مشروع ہے۔ صحیح احادیث میں اصحاب غار کا مشہور واقعہ ہے، جنہوں نے حالت مصیبت میں اللہ کو اپنے اپنے نیک اعمال کا وسیلہ پیش کیا تھا جس سے ان کی پریشانی دور کردی گئی تھی۔[1]

(۳) کسی نبی یا نیک انسان سے اس کی زندگی میں دعا کرائی جائے۔ اس کا ثبوت بھی قرآن مجید میں ملتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَآؤُوكَ فَاسْتَغْفَرُواْ اللّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُواْ اللّهَ تَوَّاباً رَّحِيماً (النساء: ۶۴)

"اگر وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، آپ کے پاس آتے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے اور رسول ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتا تو وہ یقیناً اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔"

نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں صحابۂ کرام اپنی مصیبت اور پریشانی میں دعا کی درخواست لے کر حاضر ہوتے تھے اور آپ ان کے لیے دعا فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک اعرابی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپؐ سے بارش کے لیے دعا کی درخواست کی۔ چنانچہ آپؐ نے دعا فرمائی۔ ایک ہفتہ بعد وہ شخص دوبارہ حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ بارش کی کثرت سے مویشی ہلاک ہوگئے اور مکانوں کے منہدم ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ آپؐ نے دعا فرمائی کہ اللہ بارش کو ان علاقوں میں بھیج دے جہاں اس کی ضرورت ہے۔[۲]

نیک لوگوں سے دعا کی درخواست کی مثال حضرت عمرؓ کی ہے، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے چچا حضرت عباسؓ سے دعا کی درخواست کی اور لوگوں نے اس دعا کو بارگاہ الٰہی میں بطور وسیلہ پیش کیا۔

وسیلہ کی ان تین اقسام پر امت کا اجماع ہے۔ ان کے درمیان اختلاف اس بات میں ہے کہ بعد از وفاتِ نبی ﷺ آپ کا یا گزرے ہوئے اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا دعا میں واسطہ یا وسیلہ پکڑنا جائز ہے یا نہیں؟ یعنی دعا کرتے وقت کسی نبی یا پیر کا واسطہ دے کر یہ کہا جائے کہ اے اللہ! ان کے واسطے سے ہماری دعا قبول فرما۔ علماء کے ایک بڑے طبقے کے نزدیک یہ صورت ناجائز ہے، جب کہ بعض علماء کے یہاں یہ جائز ہے۔ آئندہ سطور میں اسی مسئلہ کا تحقیقی جائزہ لیا جائے گا۔

قرآن مجید اور وسیلہ

قرآن مجید میں لفظ 'وسیلہ' دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (المائدۃ: ۳۵) ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک وسیلہ تلاش کرو۔''

باتفاق مفسرین اس آیت میں 'وسیلہ' سے مراد ذاتی نیک اعمال ہیں، جن کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا حکم دیا گیا۔ آیت کی تفسیر میں امام جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) فرماتے ہیں: یعنی اللہ کو راضی کرنے والے اعمال کے ذریعے اس کا تقرب حاصل کرو۔[۳]

امام رازیؒ فرماتے ہیں: اس آیت میں اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے اور اس کی اطاعت و فرماں برداری کو وسیلہ بنا کر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۴]

تفسیر خازن میں ہے: اس سے مراد اللہ کی فرماں برداری اور خوش نودی والے اعمال کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہے۔[۵]

مولانا انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) لکھتے ہیں: اما قولہ تعالیٰ: وابتغوا اليه الوسيلة، فذلک وان اقتضى ابتغاء واسطة، لكن لاحجة فيه على التوسّل المعروف، بالأسماء فقط. وذهب ابن تيميه الى تحريمه، وأجازه صاحب الدر المختار، ولكن لم يأت بنقل عن السلف۔ اس آیت میں اگرچہ کسی وسیلے کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اس میں ہمارے یہاں رائج ناموں سے توسّل کی کوئی دلیل نہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ اس کو حرام قرار دیتے ہیں، جب کہ صاحب درمختار نے اسے جائز قرار دیا ہے، البتہ انھوں نے اس بارے میں سلف سے کوئی روایت بیان نہیں کی ہے۔[۶]

اس آیت کے تحت اعمالِ صالحہ سے اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا مفہوم تمام مفسرین نے بیان کیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: وهذا الذى قاله هؤلاء الائمة لاخلاف بين المفسرين۔ ''ان ائمہ نے جو فرمایا ہے اس میں مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔''[۷]

وسیلہ سے متعلق دوسری آیت ہے: أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ (بنی اسرائیل: ۵۷)
''یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ تو اپنے رب کا قرب تلاش کرنے میں لگے ہیں کہ ان میں کون اقرب ہے اوراس کی رحمت کے امیدوار ہیں اوراس کے عذاب سے خوف کھاتے ہیں۔''

آیت کا شان نزول یہ ہے کہ کفارِ عرب کی ایک جماعت جنوں کی عبادت کرتی تھی۔ ایک وقت وہ آیا جب یہ جن تو ایمان لے آئے، مگر یہ کفار بدستور ان کی عبادت کرتے رہے۔ انہیں اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ ان کے معبود اللہ پرایمان لاچکے ہیں۔ دوسری طرف خود جن اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ لوگ ان کی پوجا کریں۔ چنانچہ آیت کی تفسیر میں امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

> يبتغي المدعوون أربابا الى ربهم القربة والزلفة لانهم أهل ایمان والمشركون بالله يعبدونهم من دون الله۔[8]
>
> ''جن ہستیوں کو مشرکین اپنا رب سمجھتے تھے وہ اپنے رب کی طرف وسیلہ تلاش کرتے تھے۔ یعنی وہ نیک لوگ اپنے رب کا قرب ڈھونڈھنے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن جولوگ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں وہ اللہ کو چھوڑ کران کی عبادت کرتے ہیں۔''

علامہ ابواللیث نصر محمد سمرقندی اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: يطلبون الى ربهم القرابة والفضيلة والكرامة بالأعمال الصالحة ۔[9] ''یعنی وہ نیک اعمال کے ذریعہ اپنے رب کا قرب، اس کے یہاں فضیلت اور کرامت حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔''

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: يطلبون من الله الزلفة والقربة ويتضرّعون الى الله تعالى فى طلب الجنة وهى الوسيلة ۔[10] ''وہ اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں اوراس سے جنت کی طلب میں بڑی گریہ وزاری کرتے ہیں اوریہی وسیلہ ہے۔''

علامہ بیضاویؒ لکھتے ہیں: هؤلاء الآلهة يبتغون الى الله القربة بالطاعة ۔[11]

''مشرکین جنھیں اپنا معبود سمجھ کر پکارتے ہیں وہ خود اطاعت کے ذریعہ اپنے رب کا تقرب تلاش کرنے میں لگے ہیں۔''

علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں: ممّن یبتغون الوسیلة معنی یحرصون ، فکانّہ قیل یحرصون أیُھم أقرب الی اللہ وذلک بالطاعة وازدیادالخیر والصلاة ۔۱۲؎ ''وسیلہ تلاش کرنے میں حرص وطمع کا معنی ومفہوم متضمن ہے، گویایوں کہا گیا ہے کہ وہ اس حرص میں ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ کا زیادہ قرب حاصل ہوجائے اور یہ قرب اطاعت الٰہی اورخیر وبھلائی کے کاموں میں آگے بڑھنے سے ملتا ہے۔''

صاحب جلالین نے بھی وسیلہ سے 'القربة بالطاعة' کے معنی مراد لیے ہیں۔۱۳؎ البتہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا احمد رضا خاں نے اس آیت میں 'وسیلہ' سے مقرب بندوں کا وسیلہ مراد لیا ہے۔

اسی طرح بعض لوگوں نے سورۂ النساء کی آیت ۶۴ سے توسّل بالرسل بعدالموت پراستدلال کیا ہے۔ ابن حجر ہیتمی (۹۰۹۔۹۷۴ھ) لکھتے ہیں: دلّت علی حثّ الأمة علی المجیٔ الیہ ﷺ والاستغفار عندہ والاستغفارلھم، وھذا لاینقطع بموتہ، ودلت ایضا علی تعلیق وجدانھم اللہ توّاباً رحیماً بمجیئھم واستغفارھم واستغفارالرسول لھم ۔۱۴؎ ''یہ آیت کریمہ امت کو آپؐ کے پاس آکر استغفار کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ آپؐ ان کے لیے استغفار کریں۔ یہ سلسلہ آپؐ کی وفات سے منقطع نہیں ہوا۔ نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ آپ کے پاس آئیں اوراپنے گناہوں کی معافی مانگیں اورآپؐ بھی ان کے لیے استغفار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے گا اوران پر رحم فرمائے گا۔''۱۴؎

مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے اعلاء السنن میں لکھا ہے: فینبغی لمن ظلم نفسہ ان یزور قبرہ ویستغفر اللہ عندہ فیستغفر لہ الرسول. فثبت ان حکم الآیة باق بعد وفاتہ ﷺ ۔۱۵؎ ''وہ شخص جس نے کوئی گناہ کیا ہواس کے لیے مناسب ہے کہ وہ بعدِ وفات بھی قبرمبارک کی زیارت کرے اورآپؐ کی قبر کے پاس اللہ سے استغفار کرے

تو رسول بھی اس کے لیے استغفار کریں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ حکم آپ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔"

علامہ علی بن عبد الکافی السبکی الشافعیؒ (م۷۵۶ھ) لکھتے ہیں:

"اعلم أنّه يجوز ويحسن التوسّل والاستغاثة والتشفّع بالنبی ﷺ الی ربّه سبحانه وتعالی، وجواز ذلک وحسنه من الامور المعلومة لکل ذی دین ..... وسير السلف الصالحين والعلماء والعوام من المسلمين ولم ينكر أحد ذلک من اهل الأديان، ولاسُمع به فی زمن من الأزمان حتی جاء ابن تيميه. واقول ان التوسل بالنبی جائز فی کل حال قبل خلقه وبعد خلقه۔[16]

"معلوم ہو کہ رب سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے نبی ﷺ کا وسیلہ، ان سے استغفار اور ان کی شفاعت طلب کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن ہے۔ یہ بات ہر صاحب دین، سلف صالحین، علماء اور مسلمان عوام سب جانتے ہیں۔ اہلِ ادیان میں سے کسی نے بھی اس پر نکیر نہیں کی اور نہ کبھی سننے ہی میں آیا کہ ایسا کرنا درست نہیں، تا آں کہ ابن تیمیہ نے آکر اس کو غیر درست کہا۔ میں کہتا ہوں کہ نبی کا توسل ہر حال میں جائز ہے۔ آپ کی پیدائش سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔"

یہ دعویٰ کہ نبی ﷺ کا توسّل بعد الموت اور قبل الخلق ہر حالت میں جائز ہے، قابلِ غور ہے۔ اس لیے کہ آیتِ کریمہ کا ایک خاص شانِ نزول ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک یہودی اور ایک منافق کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ یہودی سچا تھا، اس نے کہا: چل محمد (ﷺ) کے پاس، اور منافق جھوٹا تھا، اس نے کہا: چل کعب بن اشرف کے پاس، جو یہودیوں میں عالم اور سردار تھا۔ بالآخر دونوں آپؐ کی خدمت میں قضیہ لے کر پہنچے تو آپؐ نے یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ منافق جب باہر نکلا تو کہنے لگا: اچھا عمرؓ کے پاس چلو۔ وہ جو فیصلہ کر دیں وہی منظور ہوگا۔ منافق

رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا۔ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ میں مدعی اسلام ہوں، اس لیے حضرت عمرؓ یہودی کے مقابلے میں میری رعایت کریں گے۔ چنانچہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آگئے۔ جب حضرت عمرؓ نے یہ قضیہ سنا اور یہودی کے بیان سے ان کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ قضیہ آپؐ کی خدمت میں جاچکا ہے اور آپ اس معاملہ میں یہودی کے حق میں فیصلہ کر چکے ہیں تو حضرت عمرؓ نے اس منافق کو قتل کر دیا اور فرمایا: ''جو کوئی ایسے قاضی کے فیصلے کو نہ مانے اس کا فیصلہ یہی ہے۔'' اس کے وارث اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں آئے اور حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ کیا اور قسمیں کھانے لگے کہ حضرت عمرؓ کے پاس جانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس معاملہ میں صلح کرادیں۔ اس کا سبب حضور ﷺ کے فیصلے سے انکار نہ تھا۔ اس پر اس رکوع کی کئی آیات نازل ہوئیں۔[۱۷]

سلف صالحین اور متاخرین سب نے اس آیت کا یہی مفہوم سمجھا ہے کہ یہ آیت آپ ﷺ کی حیات سے تعلق رکھتی ہے۔ لوگ آپؐ کے پاس اس غرض سے آتے بھی تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے نزاع کی صورت میں فیصلہ کرانے کے لیے نبی ﷺ کی طرف رجوع نہ کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے اور انھیں منافق قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ (منافقون: ۵) ''جب ان (منافقوں) سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمہارے لیے رسول اللہ استغفار کریں گے تو وہ اپنے سروں کو جھٹک دیتے ہیں اور آپ انھیں دیکھیں گے کہ وہ تکبر کی بنا پر آپ کے پاس آنے سے رک جاتے ہیں۔''

مومنین اور منافقین کے درمیان یہی بنیادی فرق تھا کہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے بجائے کعب بن اشرف اور اس جیسے لوگوں کے پاس فیصلے کرانے کے لیے جاتے تھے اور اہلِ ایمان کی عادت تھی کہ معاملہ نزاع کا ہو یا توبہ و استغفار کا، وہ فوراً نبی ﷺ کے پاس آکر اپنی حالت بیان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھ سے یہ خطا سرزد ہوگئی ہے، آپ میرے لیے اللہ سے استغفار فرمادیں۔ مگر جب اللہ نے آپ کو فانی دنیا سے عالم برزخ میں منتقل کر دیا تو کوئی بھی آپؐ کی قبر مبارک پر اپنے معاملات

لے کر نہیں جاتا تھا اور نہ اپنے گناہوں سے استغفار کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ اگر یہ مستحسن ہوتا، جیسا کہ علامہ سبکی نے فرمایا ہے تو صحابہ اور تابعین ضرور آپ کی قبر مبارک پر حاضر ہوتے اور آپ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے۔ مگر ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ اور دیگر صحابہ وتابعین، محدثین، فقہاء، مفسرین، بڑے بڑے ائمہ کرام سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ انھوں نے خود یہ کام کیا نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلائی۔

علامہ سبکی کے ہم عصر عالم حافظ ابن الہادی (م۷۴۴ء) نے ان کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> من فهم هذا من سلف الأمة وأئمة الاسلام فاذكر لنامن رجل واحد من الصحابة والتابعين اوتابعى التابعين أوالأئمة الأربعة أوغيرهم من الائمة وأهل الحديث والتفسير انه فهم العموم بالمعنى الذى ذكرته أوعمل به أوأرشد الله فدعواک على العلماء بطريق العموم هذا الفهم دعوى باطلة ظاهرة البطلان۔[18]

> ”ہمیں بتایا جائے کہ امت کے سلف یا ائمہ اسلام میں سے کس نے یہ مفہوم مراد لیا ہے؟ صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین یا ائمہ اربعہ میں سے کسی نے یا ان کے سوا کسی بھی امام نے یا صاحب الحدیث یا صاحب التفسیر میں سے کسی نے یہ مطلب سمجھا ہے یا اس پر عمل کیا ہو یا اس کی طرف رہنمائی کی ہو۔ پس یہ عمومی دعویٰ کہ علماء نے اس کا یہ مطلب مراد لیا ہے، صریح طور پر باطل ہے۔“

بعض لوگوں نے عتبی کے واقعہ سے وسیلہ بعد الموت پر استدلال کیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ عتبی کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی قبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک دیہاتی شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ پر سلامتی ہو۔ میں نے اللہ کا کلام سنا ہے: وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَآؤُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا (النساء:۶۴) ”اگر یہ لوگ جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم

کیا تھا، تیرے پاس آتے اوراللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اوررسول ؐ ان کے لیے استغفار کرتے تو یقیناً یہ لوگ اللہ کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔" اب میں آپ کے پاس اپنے گناہوں کی بخشش چاہنے کے لیے آیا ہوں، اس کے لیے آپ کو اپنے رب کے یہاں وسیلہ بناتا ہوں۔"

علامہ ابن الہادیؒ لکھتے ہیں:

وأمّا حكاية العتبى التى أشار اليها فانها حكاية ذكرها بعض الفقهاء والمحدثين وليست بصحيحة ولاثابتة الى العتبى، وقد رويت من غيره باسنادمظلم كمابيّنّا ذلك فيماتقدّم، وهى فى الجملة حكاية لايثبت بهاحكم شرعى، لاسيّما فى مثل هذ األامر الذى لو كان مشروعاً مندوباً لكان الصحابة والتابعون اعلم به وأعمل به من غيرهم۔[19]

"جہاں تک عتبی کے واقعہ کی بات ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا، تو یہ ایساواقعہ ہے جس کو بعض فقہاء اور محدثین نے ذکر تو کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے نہ ہی عتبی سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے، یہ واقعہ عتبی کے علاوہ دوسروں سے بھی منقول ہے، مگر وہ سب تاریک (غیر معتبر) سند سے مروی ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ یہ ایسا واقعہ ہے جس سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا، خاص طور سے ایسے امور میں۔ اگر یہ مشروع ومندوب ہوتا تو صحابہ وتابعین دوسروں کے مقابلے میں ضرور اس کے بارے میں زیادہ جانتے اوراس پر دوسرے لوگ عمل کرتے۔"

عتبی کا واقعہ جن کتب (مثلاً بیہقی کی دلائل النبوۃ) میں مرقوم ہے، وہ اس لائق نہیں کہ اس سے کوئی مسئلہ ثابت کیا جا سکے۔ حقیقت میں اگر یہ فعل مستحب بھی ہوتا تب بھی صحابہ کرام اورتابعین عظام کواس کا زیادہ علم ہوتا، بلکہ وہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کرتے۔ غرض یہ کہ دیہاتی (عتبی) کا واقعہ اس پایہ کا نہیں کہ اسے کسی بات کی دلیل بنایا جا سکے۔ اس کی سند کم زور ترین اور خود ساختہ ہے۔ یہ قصہ تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہے۔[20] مگر کسی بھی معروف

محدث کی طرف اس کی نسبت نہیں، بلکہ یہ عتبی سے بیان ہوا ہے اور عتبی کا ذکر اس واقعہ کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے یہ ایک مجہول شخص کا قصہ ہے اور دین کی بنیاد ایسے مجہول فرد کی روایتوں پر نہیں رکھی جا سکتی، بلکہ اس کے لیے صحیح اور واضح دلائل ضروری ہیں۔

ابن کثیرؒ نے اسے آیت وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓاْ أَنفُسَهُم..... (النساء:۶۴) کی تفسیر میں بیان کیا ہے اور وہاں سے لوگوں نے اسے آگے پھیلایا، جن میں شیخ صابونی بھی ہیں، جنھوں نے اس حکایت کو مختصر تفسیر ابن کثیر میں نقل کرنے کے ساتھ اپنی طرف سے بلاسند ودلیل یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ: عتبی کہتا ہے کہ دیہاتی آدمی اس کے بعد وہاں سے چلا گیا اور مجھے نیند آ گئی تو مجھے نبی ﷺ خواب میں دکھائی دیے اور آپؐ نے کہا: عتبہ! اٹھو اور اس دیہاتی کو تلاش کر کے خوش خبری دے دو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا ہے۔" [۲۱]

حافظ ابن کثیر اہل سنت کے بڑے عالم اور صحیح العقیدہ مفسر ومحدث ہیں، لیکن ان کا اپنی تفسیر میں عتبی کا واقعہ نقل کرنا مروّجہ وسیلہ کی دلیل نہیں، بلکہ انھوں نے اس واقعہ کو ایسے ہی ذکر کیا ہے جیسے دیگر اسرائیلیات اور منقطع روایات اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں۔

عہد صحابہ میں وسیلہ کی کیفیت

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عمر بن الخطابؓ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے وسیلے سے دعا فرماتے تھے۔ چنانچہ یوں کہتے تھے:

> "اے اللہ! ہم آپ سے اپنے نبی ﷺ کے وسیلہ سے دعا کر کے بارش طلب کرتے تھے، اب آپؐ کے چچا کے وسیلے سے بارش کی دعا کرتے ہیں۔ چنانچہ بارش ہو جاتی۔" [۲۲]

سلیم بن عامر الخبائری سے روایت ہے کہ آسمان سے پانی برسنا بند ہو گیا تو حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیانؓ اور اہل دمشق بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے۔ جب حضرت امیر معاویہؓ منبر پر بیٹھے تو فرمایا کہ یزید بن اسود جرشیؒ کہاں ہیں؟ لوگوں نے انھیں پکارا تو وہ آگے آئے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے انھیں منبر پر بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ منبر پر چڑھے

اور نیچے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر حضرت امیر معاویہؓ نے یوں دعا کی: اے اللہ! آج ہم لوگ تیری جانب اپنے بہترین اور افضل آدمی یزید بن اسود کی سفارش پیش کرتے ہیں۔ اے یزید! آپ اپنے ہاتھوں کو بلند کیجیے۔ حضرت یزید نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور لوگوں نے بھی اپنے ہاتھوں کو اٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی جانب سے ایک بادل اٹھا اور بارش شروع ہوگئی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ ہم لوگوں کو اپنے مکانوں تک پہنچنا دشوار ہوگیا۔[۲۳]

ان واقعات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صرف باحیات نیک لوگوں کے وسیلے سے دعا کرنا جائز ہے۔ اگر فوت شدگان کی ذات کا وسیلہ بنانا درست ہوتا تو صحابۂ کرام رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کو چھوڑ کر آپ کے ایک امتی کی ذات کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کی کبھی جسارت نہ کرتے۔

علامہ ابن ابی العز حنفیؒ (م۷۹۲ھ) فرماتے ہیں:

''صحابۂ کرام نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ کی دعا کا وسیلہ اختیار کرتے تھے، یعنی آپ سے دعا کی درخواست کرتے تھے اور آپ کی دعا پر آمین کہتے تھے، جیسا کہ استسقاء وغیرہ میں ہوتا تھا، لیکن جب آپ کی وفات ہوگئی تو بارش طلب کرنے کے لیے باہر نکل کر سیدنا عمرؓ نے یوں کہا: اے اللہ! ہم اپنے نبی کا وسیلہ اختیار کرتے تھے۔ اب تیری طرف اپنے نبی کے چچا یعنی سیدنا عباسؓ کا وسیلہ لے کر آئے ہیں، جو تجھ سے ہمارے لیے دعا و سفارش کریں گے۔ آپ کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کو سیدنا عباسؓ کی قسم دی جائے، یا ان کے مقام و مرتبہ کے وسیلے سے مانگی جائے۔ اگر یہ طریقہ جائز ہوتا تو پھر نبی اکرم ﷺ کی شان و منزلت سیدنا عباسؓ کی شان و منزلت سے بہت زیادہ تھی۔''[۲۴]

علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:

''قوله: اللّٰهم كنّا نتوسّل اليک بنبينا ﷺ، ليس فيه التوسل المعهود الذى يكون بالغائب حتى قد لايكون به شعورا اصلا، فيه توسّل السلف. وهو أن يقدّم رجلاً

ذو جاهة عند الله تعالى ويأمره أن يدعو لهم ثم يحيل عليه في دعائه، كما فعل بالعباس رضي الله عنه عم النبي ﷺ. ولو كان فيه توسل المتاخرين لما احتاجوا الى اذهاب العباس رضي الله عنه معهم وليكفى لهم التوسل بنبيهم بعد وفاته ايضا، او بالعباس رضي الله عنه مع عدم شهودهم معهم۔[25]

"سیدنا عمرؓ کا یہ کہنا کہ اے اللہ! ہم آپ کے حضور اپنے نبی کی حیات میں آپؐ کا وسیلہ پیش کرتے تھے، ان الفاظ میں رائج طریقہ توسل کا کوئی ثبوت نہیں، جس میں کسی غائب (گزرے ہوئے) شخص کا وسیلہ دیا جاتا ہے، جسے اس بات تک کا شعور نہیں ہوتا کہ کوئی اس کا وسیلہ پکڑ رہا ہے۔ سیدنا حضرت عمرؓ کی اس دعا میں سلف صالحین کے طریقۂ توسل کا اثبات ہے وہ یہ کہ وہ کسی مقرب الٰہی شخص کو آگے کرتے اور عرض کرتے کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ پھر اس دعا کے حوالے سے اللہ سے دعا کرتے۔ جیسا کہ سیدنا عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چچا سیدنا عباسؓ کے ساتھ کیا۔ اگر اس واقعہ میں متاخرین کے یہاں رائج توسل جیسا توسّل مراد ہوتا تو سیدنا عباسؓ کو ساتھ لے جانے کی ضرورت کیا تھی؟ ان کے لیے تو آپ کا ہی وسیلہ کافی ہوتا، یا سیدنا عباسؓ کی عدم موجودگی میں ان کے نام کا وسیلہ دے دیا جاتا۔"

وسیلہ اور مسلک احناف

وسیلہ کی معروف شکل، یعنی یہ کہنا کہ یا اللہ! میں تجھ سے حضرت محمد ﷺ کے واسطے سے سوال کرتا ہوں، یا حضرت محمد ﷺ کے جاہ کے واسطے سے دعا قبول فرما، کسی حدیث یا آثارِ صحابہؓ سے ثابت نہیں، بلکہ اس طرح کے وسیلے کو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں نے ناجائز قرار دیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ مخلوق کا واسطہ دے کر دعا نہیں مانگی جاسکتی اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ یوں کہے کہ میں تیرے نبی/انبیاء کے حق کا واسطہ یعنی بحق محمد/بحق انبیاء وغیرہ سوال کرتا ہوں۔ علامہ زیلعی حنفی لکھتے ہیں:

"یکره أن یقول فی دعائه بحق فلان وکذا بحق أنبیائک واولیائک أوبحق رسلک أوبحق البیت أوالمشعر الحرام لأنه لاحقّ للخلق علی اللّٰه تعالی . وانّما یخصّ برحمته من یشاء من غیر وجوب علیه۔[26]

"یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ کوئی شخص یوں کہے: اے اللہ! میں بحق فلاں یا بحق انبیاء، اولیاء یا بحق بیت اللہ یا بحق مشعر الحرام آپ سے سوال کرتا ہوں۔ یہ فعل ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالی پر خلق میں سے کسی کا بھی کوئی حق نہیں، وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرے، اس پر کسی کا حق واجب نہیں۔"

یہ عبارت تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق کے سوا بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۱۲۶/۵، الھدایہ فی شرح بدایۃ المبتدی ۳۸۰/۴، متن بدایۃ المبتدی فی فقہ الامام ابی حنیفۃ ۲۴۸/۱، العنایۃ شرح الھدایۃ ۶۴/۱، ۲۴۸/۱۲، رد المحتار علی الدر المختار ۵۶۹۱۹، کتاب الحظر والاباحۃ، باب الاستبراء، بحر الرائق شرح کنز الدقائق ۲۳۵/۸ میں بھی موجود ہے۔

علامہ عبدالحی لکھنوی حنفیؒ فرماتے ہیں:

"نبی ﷺ کی وفات کے بعد ان سے دعا کرانا یا اپنی حاجت روائی کے واسطے، کسی طرح ان کو تکلیف دینے کا دستور قرون ثلاثہ مشہود لھا بالخیر (وہ تین زمانے جن کے سراپا خیر ہونے کی شہادت دی گئی ہے) اور زمانۂ مجتہدین میں نہیں پایا گیا۔ بناءً علیہ، ہمارے فقہاء حنفیہ اس میں مختلف ہیں۔ اکثر عدم جواز کے قائل ہیں۔ واضح رہے کہ یہی مذہب اکثر فقہاء کا قابل فتوی ہمارے زمانے کے لیے ہے، کیوں کہ اس میں احتیاط ہے۔"[27]

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ لکھتے ہیں:

"دعا میں اللہ تعالی کو کسی جاہ وحرمت کا واسطہ دینا وہ طریقہ نہیں ہے جو اللہ تعالی اور اس کے رسول پاکؐ نے ہم کو سکھایا ہے۔ قرآن مجید تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس تخیل سے بالکل خالی ہے۔ حدیث پاک

میں بھی اس کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں۔ صحابہ کرام میں سے بھی کسی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ انھوں نے دعا میں یہ طریقہ خود اختیار کیا ہو، یا دوسروں کو اس کی تعلیم دی ہو۔ معلوم نہیں کہ مسلمانوں میں یہ تخیل کہاں سے آ گیا کہ رب العالمین کے حضور دعا مانگتے وقت اسے کسی بندہ کی جاہ و حرمت کا حوالہ دیں، یا اس سے یہ عرض کریں کہ اپنے فلاں بندہ کے طفیل میری حاجت پوری کر دے۔'' ۲۸

فوت شدہ بزرگان دین کا وسیلہ

ظاہری بات ہے کہ جب بعد از وفات حضورﷺ کا وسیلہ ثابت نہیں تو آپؐ پر قیاس کر کے بزرگان دین سے وسیلہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ وسیلہ بعد از وفات کی بات علامہ تقی الدین عبدالکافی بن علی السبکی الشافعی نے لکھی ہے: **ان التوسل بالنبی ﷺ جائز فی کل حال قبل خلقه وبعد خلقه فی مدة حیاته فی الدنیا وبعد فوته فی البرزخ۔** ۲۹ ''نبیﷺ کا وسیلہ اختیار کرنا ہر حال میں جائز ہے، چاہے آپ کی تخلیق سے پہلے ہو یا تخلیق کے بعد۔ آپؐ کی دنیاوی زندگی میں ہو یا وصال کے بعد حیات برزخ میں۔''

وسیلہ قبل خلق ثابت کرنے کے لیے انھوں نے مستدرک حاکم کی ایک روایت کا سہارا لیا ہے، جو ضعیف ہے۔ اور بعد وفات کے اثبات کے لیے ایک حکایت کو بطور دلیل نقل کیا ہے۔ پوری روایت اس طرح سے ہے:

طبرانی نے معجم میں حضرت عثمان بن حنیف سے نقل کیا کہ ایک آدمی اپنی حاجت لے کر حضرت عثمان بن عفانؓ سے ملنے کے لیے چکر کاٹتا تھا، لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ وہ عثمان بن حنیف سے ملا اور ان سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جاؤ وضو کرو اور پھر مسجد پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھو۔ اس کے بعد یہ دعا مانگو: اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں اپنے نبی محمدﷺ کے واسطے سے، جو کہ نبی الرحمۃ ہیں۔ اے نبی! میں آپ کے واسطہ سے

متوجہ ہوں آپ کے رب کی طرف، تا کہ وہ میری ضرورت پوری کر دے۔ یہ دعا کرتے ہوئے اپنی ضرورت کا تصور رکھنا، چلو، میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔ چنانچہ اس شخص نے عثمان بن حنیف کے کہنے پر عمل کیا۔ پھر حضرت عثمان بن عفانؓ کے دروازے پر پہنچا تو دربان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے جا کر حضرت عثمان کے پاس ان کی مسند پر بٹھا دیا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس سے کہا: تیری کیا ضرورت ہے؟ اس نے اپنی ضرورت بتائی تو انھوں نے وہ فوراً پوری کر دی اور فرمایا کہ تو نے آج تک اپنی ضرورت کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا؟ تیری جو بھی ضرورت ہو، آ کر ہم سے کہہ دے۔ اب وہ شخص حضرت عثمان غنیؓ کے پاس سے اٹھ کر عثمان بن حنیف کے پاس آیا اور ان کا شکریہ ادا کر کے کہنے لگا کہ وہ تو میری ضرورت کی طرف دھیان ہی نہ دیتے تھے۔ آپ نے ان سے کہا تو انھوں نے میری ضرورت پوری کر دی۔ عثمان نے قسم کھا کر کہا کہ میں نے عثمان غنیؓ سے تیرے یا اپنے لیے کوئی سفارش نہیں کی، ہاں میں آں حضورﷺ کی مجلس میں تھا کہ ایک نابینا آیا اور اس نے دعا کی درخواست کی تو آپؐ نے اس کو یہی دعا سکھلائی تھی، چنانچہ وہ فوراً بینا ہوگیا تھا۔ میں نے تجھے وہی دعا سکھا دی۔

یہ روایت نہایت ضعیف ہے۔ اس کا راوی عبداللہ بن وھب الفھری ہے، جو عثمان بن حنیف سے نقل کرتا ہے۔ اسے اگرچہ بعض ائمہ نے ثقہ کہا ہے، مگر اکثر محدثین نے انھیں ضعیف ومنکر کہا ہے۔ اس پر درج ذیل جرح کی گئی ہے:

ابن سعد: وہ حدیثوں میں تدلیس کیا کرتا تھا۔

حافظ ابن حجرؒ: وہ مدلسین میں سے ہے۔

یحی بن معین: وہ ضعیف ہیں۔

ابن عدی: ابن عیینہ اور سفیان بن عیینہ کے مجلس درس میں وہ سوتا تھا۔

زکریا بن کریا الساجی: سماع میں وہ تساھل برتتا تھا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن وھب کے استاذ شبیب کی روایات جو ان (شبیب) کے بیٹے احمد سے مروی ہیں ان میں کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ان روایات

میں ہے جو عبداللہ بن وہب نے شبیب سے نقل کی ہیں۔(لاباس بحدیثه من روایة ابنه احمد عنه لامن روایة ابن وهب۔) ۳۰؎

ابن عدیؒ لکھتے ہیں:

وبشبیب بن سعید نسخة الزهری عنده عن یونس عن الزهری وهی احادیث مستقیمة وحدث عنه ابن وهب باحادیث منکر. ۳۱؎

(شبیب کے پاس امام زہریؒ کی روایات کا نسخہ تھا، جس میں یونس کے واسطہ سے روایات درج تھیں۔ اس میں تمام احادیث درست ہیں، لیکن ابن وهب نے اس سے منکر احادیث بیان کیں۔

شبیب کی روایات صحیح بخاری میں بھی ہیں، مگر ان میں ایک بھی روایت عبداللہ بن وہب کے واسطے سے نہیں ہیں، بلکہ شبیب کے بیٹے احمد عن یونس بن زید الایلی کے واسطے سے ہیں۔ حاصل یہ کہ عبداللہ بن وہب کے استاذ شبیب بن سعید ایک ثقہ راوی ہیں، لیکن ان سے جو روایات عبداللہ نے نقل کی ہیں وہ سب منکر اور ضعیف ہیں، اس لیے اس روایت کو صحیح کہنا درست نہیں۔

یہ روایت امام بخاریؒ کی التاریخ الکبیر میں بھی ہے۔ واضح رہے کہ امام بخاری جو روایات 'التاریخ الکبیر' میں نقل کرتے ہیں، ان کا وہ مقام و مرتبہ نہیں جو صحیح بخاری کا ہے۔ التاریخ الکبیر کے رجال اور صحیح بخاری کے رجال میں بہت فرق ہے۔ صحیح بخاری کے رجال کا جو مقام و مرتبہ ہے وہ التاریخ الکبیر کے رجال کا نہیں۔ التاریخ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اس میں صحیح سے نیچے درجہ کی حسن اور ضعیف بلکہ بہت ضعیف روایات بھی نقل ہوئی ہیں۔ اسی لیے محدثین کے نزدیک اس کا مقام و مرتبہ وہ نہیں جو صحیح بخاری کا ہے۔

اس کے علاوہ یہ روایت جن کتب حدیث میں آئی ہے وہ مرتبہ میں تیسرے اور چوتھے بلکہ پانچویں درجہ کی ہیں، مثلاً معجم للطبرانی، منذری کی الترغیب والترھیب، بیہقی کی دلائل النبوۃ، ابونعیم کی معرفۃ الصحابۃ وغیرہ۔ ان میں بہت سی کتابوں میں

بے سند روایات نقل کی گئی ہیں۔ حساس مسائل تو دور کی بات، ثبوت استحسان تک میں ان کی روایات لائق اعتبار نہیں۔[۳۲]

ان کتب کے مؤلفین نے سند و بے سند تمام روایات کو اس لیے ایک جگہ جمع کر دیا کہ قاری ان کی اسناد اور متون دیکھ کر خود ان کی حیثیت کا اندازہ لگا لیں گے۔ مگر تحقیق تو دور کی بات ہے، بعد کے لوگوں میں علمی انحطاط آیا تو انھوں نے ان ائمہ کی جلالت شان دیکھ کر ان کی بیان کی ہوئی ایک ایک روایت کو من و عن نقل کرنا شروع کر دیا، جس میں واعظین کے لیے بڑی چاشنی تھی اور روافض اور دشمنوں کے لیے دین میں فساد پھیلانے کا سامان۔ اس لیے وہ ان روایات کو اپنے اچھے اور برے مقاصد کے لیے مشتہر کرنے لگے۔

وسیلہ بعد الموت اور قبل الخلق کے حامی ان ہی کتب کی روایات کا حوالہ دیتے ہیں۔ مثلاً مستدرک حاکم کی یہ روایت کہ جب حضرت آدم سے خطا ہوگئی تو انھوں نے محمد ﷺ کے وسیلہ سے دعا مانگی، اللہ نے اسے قبول فرمایا۔ اس روایت کے تمام طرق ناقابل اعتبار ہیں۔ اس موضوع پر کوئی بھی روایت صحیح نہیں، بلکہ ابن جوزی نے اسے موضوع تک کہا ہے۔ درایۃً اس لیے کہ خود قرآن سے ثابت ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں کچھ کلمات القاء فرمائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرۃ:۳۷) ''اس وقت آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات حاصل کیے، جس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔'' قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر وہ کلمات بھی بیان کر دیے گئے، جو ان پر القاء کیے گئے تھے: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (الاعراف:۲۳) ''وہ دونوں بول اٹھے: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا۔ اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔'' حضرت آدم نے ان کلمات کے ذریعہ اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی خطا معاف فرما دی۔

البتہ وسیلہ کے تعلق سے قرآن کریم میں ایک آیت بڑی واضح ہے، جسے اس

موقع پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ (البقرۃ:۸۹)

''اور جب آئی ان کے پاس ایسی کتاب جو تصدیق کرتی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے، حالاں کہ وہ اس کے نازل ہونے سے پہلے اس کے ذریعہ اللہ سے فتح طلب کیا کرتے تھے کافروں کے خلاف۔ پس جب وہ چیز ان کے سامنے آگئی اور اسے انھوں نے پہچان لیا، اس کے باوجود اس کا انکار کر دیا۔''

آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں جب مشرک اور یہود کے درمیان جنگیں ہوتیں تو یہود کہتے کہ نبی آخر الزماں کے مبعوث ہونے کا وقت آچکا ہے۔ وہ جب مبعوث ہوں گے تو ہم ان کی اتباع کریں گے اور تمھیں قتل کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس جب اللہ عز وجل نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تو مشرکین نے آپؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور یہود زیادہ تر کافر ہی رہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

اس آیت کے تحت یہ بات تقریباً تمام ہی مفسرین نے اپنی تفسیروں میں نقل کی ہے کہ یہود کہا کرتے تھے: سنتبعه ونقاتلكم، یعنی جب وہ نبی مبعوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے ان کی اطاعت کریں گے اور ان کے ساتھ تم لوگوں سے جنگ کریں گے۔

یہودیوں کے اس قول میں اصل چیز رسول پر ایمان اور آپؐ کی اطاعت ہے۔ آج بھی اگر کوئی رسول پر اپنے ایمان اور آپؐ کی اطاعت کا واسطہ دے کر دعا کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ قرآن میں اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (آل عمران:۵۳)

''اے ہمارے رب! ہم آپ کی نازل کردہ شریعت پر ایمان لائے اور رسول کی اتباع کی، پس ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ دیجیے۔''

اسی کی بنیاد پر علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے: اسألك اللهم بنبيك (اے

اللہ! میں تیرے نبی کے واسطے سے مانگتا ہوں) میں مانگنے والے کی مراد اگر بسبب ایمان ،محبت اوراطاعت رسول ہوتو کوئی حرج نہیں،مگر عام طور پرلوگ ایسانہیں کرتے، بلکہ وہ اس جملہ کو مطلق رکھتے ہیں اوراس سے وہ معنی مراد لیتے ہیں جس کی سلف میں کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ قرآن وسنت میں اس کی کوئی دلیل ہے،لہٰذا یہ قابلِ رد ہے۔۳۳؎

حاصل یہ کہ مروجہ توسل بعد وفات النبی کسی مستند حدیث اور خیر القرون کے عمل سے ثابت نہیں۔صحابہ اورتابعین بلکہ کسی بھی زمانہ میں اس پرعمل نہیں ہوا۔دوسری طرف یہی وسیلہ شرک وبدعت کا ذریعہ ہے۔ہندوپاک میں ایک بڑاطبقہ مشرکین مکہ کے طرز پر غیراللہ کو مشکل کشا،متصرف الامور، حاضر وناظر، کائنات کا مالک ومختار اور سب کچھ سمجھتا ہے۔ان کے ان شرکیہ عقائد کی وجوہ میں وسیلہ بھی ہے، جسے وہ انبیاء واولیاء سے روا رکھتے ہیں۔مشرکینِ مکہ تو اللہ ہی کو خالق ومالک، زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا، مضطر کی دعاؤں کو قبول کرنے والا سمجھتے تھے،مگر یہ لوگ ان سے بھی آگے بڑھ کر مخلوق کو خالق ومالک اورمتصرف الامور وغیرہ گردانتے ہیں، جوصریحاً شرک ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب حدیث الغار۔

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء، باب الاستسقاء فی المسجد الجامع

۳۔ محمد بن جریر طبری، جامع البیان (تفسیر طبری)، قاہرہ،۲۰۰۱ء،۴۰۳/۸،

۴۔ فخرالدین رازی، مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)، بیروت،۱۹۸۱ء،۲۲۴/۱۱،

۵۔ علی بن محمد بن ابراہیم المعروف بالخازن، لباب التأویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن)، بیروت ۲۰۰۴ء،۳۹/۲،

۶۔ انورشاہ کشمیری، فیض الباری علی شرح بخاری، کتاب الجہاد، باب من استعان بالضعفاء

۷۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر)، دارطیبہ ریاض ۱۴۲۱ھ،۱۰۳/۳،

۸۔ تفسیر طبری،۶۲۷/۱۴

۹۔ ابواللیث نصر محمد السمر قندی، تفسیر بحر العلوم، بیروت ۱۹۹۳ء،۲۷۳/۲

۱۰۔ ابوعبداللہ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی)، بیروت،۲۰۰۶ء،۱۰۶/۱۳

۱۱۔ ناصرالدین البیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل (تفسیر بیضاوی)، بیروت طبع اول،۲۵۹/۳

۱۲۔ زمخشری، الکشاف، طبع بیروت، ۲۰۰۹ء، جزء ۱۵، سورۃ الاسراء، آیت: ۵۷، ص ۶۰۰
۱۳۔ جلال الدین السیوطی وجلال الدین المحلی، تفسیر جلالین، طبع قاہرہ، ۱۹۹۰ء، جزء ۱۵، سورۃ الاسراء: ۵۷، ص ۲۶۷
۱۴۔ ابن حجر مکی رالھیتمی، الجوہر المنظم، فصل اول، ص: ۱۷، قاہرہ۔
۱۵۔ ظفر احمد تھانوی، اعلاء السنن، ابواب الزیارۃ المنبویہ، باب زیارۃ قبر النبی ﷺ مطبوعہ کراچی، پاکستان، ص: ۴۹۸ تا ۵۱۲۔
۱۶۔ علی بن عبد الکافی السبکی، شفاء السقام، طبع لبنان، ۲۰۰۸ء، طبع اول، ص ۳۵۸
۱۷۔ شبیر احمد عثمانی، تفسیری حواشی، (ترجمہ شیخ الہند) سورۃ النساء، آیت ۶۰-۷۰
۱۸۔ محمد بن احمد بن عبد الھادی الحنبلی، الصارم المنکی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۲۳
۱۹۔ حوالہ سابق، ص: ۳۲۳
۲۰۔ تفسیر ابن کثیر، ۳۴۷/۲
۲۱۔ محمد علی الصابونی، مختصر تفسیر ابن کثیر، دار القرآن الکریم، بیروت ۱۹۸۱ء، ۴۱۰/۱ء
۲۲۔ صحیح بخاری، کتاب العیدین، ابواب الاستقاء، باب سوال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا۔ کتاب المناقب، ذکر عباس بن عبد المطلب۔
۲۳۔ ابن قدامۃ، الکافی فی فقہ الامام احمد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، باب صلاۃ الاستسقاء، ۳۴۸/۱
۲۴۔ ابن عبد العز، شرح العقیدۃ الطحاویہ، ۲۹۹/۲، تحقیق: شعیب الأرنوط، مطبوعہ: موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء
۲۵۔ فیض الباری، شرح صحیح البخاری: ۳۷۹/۲
۲۶۔ زیلعی حنفی، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، ۳۱/۶، مصر، ۱۳۱۵ھ
۲۷۔ عبد الحی لکھنوی، مجموع الفتاوی، ص: ۲۷۴، فتوی نمبر: ۲۸۵، سوال نمبر ۲ کا جواب، مطبع علوی، لکھنؤ۔
۲۸۔ ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، محرم صفر ۱۳۷۷ھ، اکتوبر نومبر ۱۹۵۷ء
۲۹۔ شفاء السقام/۳۵۸
۳۰۔ ابن حجر عسقلانی، تقریب التہذیب، دار العاصمہ ۱۴۲۱ھ، ص ۴۳۰
۳۱۔ ابن عدی، کتاب الکامل فی ضعفاء الرجال، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، ۴۹/۵
۳۲۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، مطبوعہ بیروت ۲۰۰۵ء، ۲۳۳/۱
۳۳۔ ابن تیمیہ، قاعدہ جلیلۃ فی التوسل والوسیلۃ، طبع ریاض، طبع اول، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۸

بحث ونظر

اخلاقی اقدار کا تصور۔ فکرِ اقبال میں

______ ڈاکٹر فیاض احمد فاروق

اخلاق وہ اساسی علم ہے جس سے انسانی شخصیت کی نشو ونما ہوتی ہے اور اس کی سنہری کرنیں انسان کی معاشرتی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ گویا یہ وہ علم ہے جو انسان کے کردار و افعال، طرز حیات اور شخصیت سازی میں نکھار پیدا کرتا ہے اور اسی سے معاشرتی زندگی کی تعمیر وترقی ہوتی ہے۔ اخلاق ایک جامع تصور کا نام ہے، جو پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ انسانی تہذیب کی بنیادیں بھی اخلاقی اقدار پر قائم رہ سکتی ہیں، اس لیے اخلاقی اقدار کو معاشرتی زندگی کی اصلاح کا بھی بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور انسانی تہذیبوں میں اسلامی تہذیب وہ عملی طریقہ ہے جس سے شخصیت کی نشو ونما ہوتی ہے۔

علامہ محمد اقبال (م ۱۹۳۸ء) برصغیر کے وہ عظیم شاعر، فلسفی اور مذہبی اسکالر ہیں، جنھوں نے اپنی فکر میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمو دیا ہے۔ اس میں جہاں تعمیرِ انسانیت، فکر وعمل اور طرزِ حیات کی بات ہوتی ہے وہیں اس کی بنیادیں اسلام کے اساسی مآخذ سے پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اسلام کی اساسی تعلیمات ہی ان کے افکار کی بنیاد ہیں۔ جہاں تک عادات و اطوار اور اقدار کا تعلق ہے تو فکر اقبال میں اس تصور کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ انسان اپنی تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی میں ان اقدار سے مزین ہو کر اپنی زندگی گزارے۔ اقبال نے انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے فلسفۂ خودی کا تصور دیا ہے۔ اس فلسفہ میں انھوں نے چار بنیادی عناصر (اخلاقی اقدار، عشق، جرأت اور حریت) کا پیغام دیا ہے۔ تعمیر خودی، تعمیر اخلاق اور تعمیر کردار ہی کا نام ہے، اسی لیے علامہ اقبالؒ نے تربیتِ خودی پر بہت زور دیا ہے کیوں کہ اسی سے انسانی شخصیت کی تعمیر ہوتی اور اس سے انسانی زندگی کامل نمونہ بنتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے استحکامِ خودی، اثباتِ

خودی اور نفاذ خودی کو اسلامی تعلیمات اور مغربی اخلاقی روایات کی بنیاد پر جدید انداز میں پیش کیا ہے۔ اس فلسفے کی وضاحت ان کی بہت سی کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ان کے نزدیک اخلاق کے لیے شرط ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزاری جائے،اس کے ذریعہ قوموں کے اجتماعی کردار میں حسن و جمال کی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔

اقبال کے فلسفۂ اخلاق کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ اخلاق کس چیز کا نام ہے؟ اور انسانی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے؟

اخلاق کا معنیٰ ومفہوم

اخلاق خلق کی جمع ہے جس کے معنیٰ اچھی عادات،تہذیب، انسانیت، ملنساری، مروت کے ہیں،یعنی وہ علم جس میں تہذیب نفس اور معاشرتی معاملات کے اصولوں سے بحث ہوتی ہے۔[۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تہذیب نام ہے اچھے طور طریقوں کے اختیار کرنے،اس کے مطابق زندگی گزارنے اور عام معاشرتی معاملات کو اس کے مطابق ڈھالنے اور ایسا طریقہ وضع کرنے کا جو آپ کو دیگر انسانوں سے ممتاز کر دے۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وانَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (القلم:۴)

''اور تمہارے اخلاق بہت اعلیٰ ہیں''۔

جب ہم رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی بات کرتے ہیں تو آپؐ کی پوری زندگی ہمارے لیے کامل نمونہ ہے۔یہ اعلیٰ نمونہ آپؐ کے اوصاف حمیدہ، عادات مطہرہ اور کمالات جلیلہ کی وجہ سے ہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں 'خلق' کی بڑی عمدہ تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''خلق نفس کی اس ہیئت راسخہ کا نام ہے جس سے تمام افعال بلا تکلیف صادر ہوں۔ اگر یہ افعال عقلاً اور شرعاً عمدہ اور قابل تعریف ہوں تو اس ہیئت کو'خلق نیک'اور اگر برے اور قابل مذمت ہوں تو اس ہیئت کو 'خلق بد' کہتے ہیں'' ۔[۲]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اخلاق کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''خلق انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جو اس کی طبیعت کے مختلف اوصاف کی جدّ و جہد کر کے اپنی جانب راجع کرے'' ۔[۳]

گویا اخلاق سے مراد کسی شخص کے کردار اور عادات کے ہیں۔انسان کا کردار ہی اس کے لیے بھلائی یا برائی کا سبب بنتا ہے۔اس سے مراد ایسا کردار بھی ہے، جس سے انسانی روح کو بالیدگی ملتی ہے ، انسان اچھے اعمال کی طرف راغب ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار اور اخلاقی معیارات کی تنفیذ اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔کردار کی پختگی میں ایسا نشو و ارتقاء ہوتا ہے جس کی بنیاد پر اچھے اور برے کی تمیز سے روشناس ہو کر صرف اچھائی کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔اسی بات کی وضاحت ہمیں احادیث میں ملتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

البرّ حسن الخق والاثم ماحاک فی صدرک وکرھت ان یطّلع علیہ الناس ۔[۴]

''نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو لوگوں کو اس پر باخبر ہونے کو ناپسند کرے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق سے ہی انسان کے کردار کی تطہیر ہوتی ہے اور یہ اخلاق انسان کے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسانی شخصیت میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کی حیثیت مسلمہ ہے۔

جہاں تک علم اخلاق کا تعلق ہے تو اس سے مراد وہ علم ہے جو بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے اور اس کو بیان کرے کہ انسانوں کو آپس میں کیسے معاملہ کرنا چاہیے اور اس کو واضح کرے کہ انھیں اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصد عظمیٰ کو

پیش نظر رکھنا چاہیے، مفید اور کار آمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے۔۵

گویا علم الاخلاق کا موضوع دو قسم کے اعمال پر مشتمل ہے:

۱۔ وہ اعمال جو انسان کے اختیار و ارادے سے صادر ہوتے ہوں اور عمل کے وقت جن کے بارے میں وہ خوب جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

۲۔ وہ اعمال جو عمل کے وقت اگرچہ بغیر ارادہ صادر ہوتے ہیں ،لیکن اختیار، شعور اور ارادہ کے وقت ان کے متعلق احتیاط برت سکتا ہے۔اور یہی وہ اعمال ہیں جن پر خیر اور شر یا اچھے اور برے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔۶

''نفس انسانی اپنے کردار میں تین امور میں سے کسی ایک امر سے متعلق ہوتا ہے۔ایک طبیعت، دوسرا حال اور تیسرا ملکہ طبیعت جبلت کا نام ہے، جس میں تغیر و تبدل کا قطعی امکان نہیں، حال نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے استبداد قبول کی بنا پر نفس متکیف ہوتا ،مگر جلد ہی زوال بھی قبول کر لیتا ہے، جب کہ ملکہ اس کیفیت یا قوت کا نام ہے جو نفس انسانی میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس کا زوال ہو تو سکتا ہے لیکن بمشکل اور بتا خیر۔اس کے بعد یہ واضح ہے کہ خلق ان تینوں کیفیات میں سے نفس کی اس کیفیت سے متعلق ہے جو ملکہ کہلاتی ہے اور اس کا حال مزاج سا نہیں ہے۔لہٰذا علم الاخلاق کے ذریعے اس کی تہذیب و اصلاح ممکن ہے''۔۷

علامہ اقبال کے افکار و نظریات کو جمع کر لیا جائے تو طرز معاشرت کے پہلو سے اسلامی اخلاقی تصور جنم لیتا ہے۔ان کے افکار میں خودی، انسان کامل، شاہین اور فقر وغیرہ کے تصورات سب اسلامی اخلاق کے مظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ان کے ان تصورات میں اسلامی تعلیمات کو بھی بخوبی دیکھا کیا جا سکتا ہے اور عصری تقاضوں کی روشنی میں ان کی فکر میں ایک نئی روح بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔اس روح کو جسم میں حلول کر کے کائنات انسانی پر اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی ممکن بنائی جا سکتی ہے اور اپنا رویہ اور کردار بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

انسانی زندگی اور فطرت

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو تمام رذائل سے پاک ہوتا ہے اور اس کا دل تمام خوبیوں، حقائق و معارف سے مزین ہوتا ہے۔ پھر جیسے جیسے وہ اس دنیا کے مزاج سے آشنا ہوتا ہے تو دنیاوی اسباب وعوامل اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، جن کی بعد میں تطہیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تطہیر تزکیہ نفس سے کی جاتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

ما من مولود الا یولد علی الفطرة۔[8]

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے''۔

ہر بچہ بنیادی طور پر فطرت پر پیدا ہوتا ہے، مگر خاندانی، معاشرتی، سماجی، ثقافتی، تمدنی اور تہذیبی اسباب وعوامل کی بنیاد پر وہ اچھائی یا برائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے، جو بعد میں انسانی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ انسان اپنی فطری صلاحیت کے ذریعے حق و باطل، خیروشر اور نیکی وبدی کے درمیان تمیز کر لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ اور عمل کی آزدی دے رکھی ہے۔ وہ اپنے ارادے سے خیر یا شر کا عمل کرتا ہے۔ جب انسان کے عمل میں بگاڑ پیدا ہو جائے یا وہ برائی کا دل دادہ ہو جائے تو پھر اسے ہدایت کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ ہدایت بھی اس کی سیرت و کردار سازی کے لیے ہوتی ہے، تاکہ وہ رذائل کو چھوڑ کر اچھائیوں کی طرف مائل ہو جائے۔

اقبال زندگی کا حقیقی مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جہاں حرکت وارتقاء اور مسلسل اخلاقی نہیں وہاں زندگی کا فقدان ہے۔ جنت اگر جزائے اعمال حسنہ ہو تو وہ اس کیفیت نفس کا نام ہونا چاہیے جہاں عرفان خووی، استحکام خودی اور عشق خلاق ترقی یافتہ صورتوں میں پایا جائے۔ دوزخ خودی کے سوخت ہو جانے کا نام ہے، اس لیے دوزخ کی ماہیت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ وہ ایک آگ ہے جس کے شعلے کسی خارجی ایندھن سے نہیں، بلکہ قلب انسانی میں سے بلند ہوتے ہیں۔[9]

زندگی کا مقصد اللہ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے، تاکہ انسان بہتر انداز میں اپنی شخصیت سازی کر سکے۔ انسان کے افعال و اعمال کا تعلق اس کے نفس کے ساتھ مربوط ہے، جس کی اصلاح ضروری ہوتی ہے، کیوں کہ اسی سے انسانی افعال سرانجام پاتے ہیں اور خیر و شر کی عملی شکلیں سامنے آتی ہیں۔ حیاتِ ظاہری کی طرح انسان کی باطنی اور روحانی زندگی بھی قلب انسانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ قلب، انسان کے فکر وخیال کا مرکز ہوتا ہے اور یہی قلب انسان کی اصلاح و بگاڑ کا بنیادی سبب بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قلب انسانی کی اس اہمیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

الا و ان فی الجسد مضغة، اذا صلحت، صلح الجسد کله،
و اذا فسدت، فسد الجسد کله. الاوهی القلب۔[۱۰]

''سن لو بدن میں ایک گوشت کا ٹکرا ہے۔ اگر وہ درست ہو گا تو سارا بدن درست رہے گا اور اگر وہ بگڑا تو سارا بدن بگڑ جائے گا۔ سن لو! وہ ٹکرا آدمی کا دل ہے''۔

انسانی جسم میں قلب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ انسان میں سید وحکمراں صرف قلب ہے اور وہی اپنی رعیت یعنی دیگر اعضائے جسمانی کی نگرانی کا ذمہ دار ہے۔ وہی جسم انسانی کے عالم کا کرتا دھرتا ہے۔ علمائے نفس اسی کے احوال وکوائف سے بحث کرتے اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہی انسانی علوم اور انسانی انانیت کا مرکزی موضوع گفتگو رہتا ہے''۔[۱۱]

انسانی جسم کا یہ حصہ اگر درست ہو جائے تو پورا نظام جسمانی بھی درست رہتا ہے اور اس سے صادر ہونے والے اعمال و افعال اور اخلاقی نظام بھی درست رہتا ہے۔ لیکن اگر اس میں بگاڑ آ جائے تو فکر وخیال اور اخلاق وعمل، سب فساد کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر یہ اخلاق و اعمال انسانی شخصیت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور انہی اثرات کی وجہ سے انسان رذائل کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ضبط نفس کا تعلق ہے تو اس سے مراد، نفسانی خواہشوں اور ذاتی

اغراض پر قابو پانا ہے۔ چوں کہ انسان کے نفس میں خوف اور محبت کے دو عناصر ایسے ہیں جو اکثر اسے راہ راست سے ہٹا دیتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اس پر کڑی نظر رکھی جائے اور نفس کو مغلوب ہونے سے بچایا جائے۔ جب اطاعت و ضبط نفس کی منزلوں سے کسی فرد کی خودی، کام یاب گذر جاتی ہے تو وہ نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے، جو تخلیق انسانی کا مقصد خاص ہے اور جس کے حصول کے لیے انسان روز اول سے سرگرم عمل اور مزاحمتوں سے برسر پیکار ہے۔

اقبال کا فلسفۂ اخلاق

اقبال کی شاعری اظہار و تصورات کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف اور منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے عہد کو بلکہ مستقبل کو بھی اپنے افکار سے متاثر کیا ہے۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ عناصر نے انہیں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے ایسا بلند مقام دیا ہے جو شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو۔

اقبال کے فلسفۂ اخلاق کے بارے میں سعید احمد رفیق لکھتے ہیں:

> ''اقبال ایک مفکر ہیں۔ ان کے نظام فکر میں اخلاق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اخلاقی طور پر وہ قانونی نہیں، بلکہ غایتی ہیں۔ انہوں نے اخلاقی معیار کو ایک ام الفضائل کی شکل میں پیش کیا ہے''۔[۱۲]

مولانا عبدالسلام ندوی کہتے ہیں:

> ''وہ اخلاقی حیثیت سے نہ نٹشے کے مقلد ہیں نہ صوفیوں کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ خالص اسلامی اور قرآنی اخلاق کی تعلیم اور دعوت دیتے ہیں، جو صلح و جنگ، رزم و بزم سب پر حاوی ہے''۔[۱۳]

اقبال کے افکار میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ ان کے وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ گہرے تفکر اور مشرقی و مغربی فلاسفہ سے استفادے کا سبب بھی ہے، لیکن یہ امر اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اسلامی نظریات و اخلاقیات کو اپنی فکری اساس بناتے ہیں۔ ان کے فکری و اخلاقی نظریات میں عالمگیریت کا پہلو نمایاں ہے۔

عزیز احمد لکھتے ہیں:

''اقبال نے اسلامی اخلاقیات سے زیادہ تر انہیں (اسلامی) اقدار کو چننے کی کوشش کی ہے، اگرچہ وہ اسلام کا نام بار بار لیتے ہیں، لیکن دراصل یہ اخلاقی اقدار تمام بڑے مذہبوں اور ہر اخلاقی فلسفے میں مشترک ہیں''۔[۱۴]

اقبال کے فلسفہ اخلاق کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر حسن ملک کہتے ہیں:

''اقبال کا فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ خودی سے مختلف نہیں ہے۔ وہ فرد اور معاشرے کے تعلقات، افراد کی ذمہ داریاں اور حقوق اور معاشرتی تحفظ واتحاد سب کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ انفرادی زندگی اور اجتماعی حیات کے اسرار ورموز کو ایک دوسرے کے ساتھ منضبط رکھتے ہیں، تاکہ ان کے فلسفۂ حیات میں توازن برقرار رہے۔''[۱۵]

اقبال نے ایک خاص طرز زندگی کا پیغام دیا ہے اور انفرادی واجتماعی طور پر اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ زندگی کی دیگر اقدار اور روایات سے باہم پیوستہ رہتی ہیں۔ اقبال زندگی کو ایک وحدت مانتے ہوئے اسے دین ودنیا کے مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کرتے، بلکہ ان کے نزدیک دین ودنیا میں دوئی کسی صورت بھی قابل تحسین نہیں ہے۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی[۱۶]

وہ اپنی ایک اور نظم 'دین وسیاست' میں اسی خیال کو یوں پیش کرتے ہیں:

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نا مرادی
دوئی چشم تہذیب کی نا بصیری[۱۷]

اقبال کے اس پہلو کو اخلاقی نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ

عبدالحکیم کہتے ہیں:

''اسلام کی نسبت علامہ اقبال کے افکار حکیمانہ ہیں۔ انگریزی خطبات میں بھی اور اشعار میں بھی جا بجا یہ زاویۂ نگاہ ملتا ہے کہ اسلام ماہیت حیات و کائنات کے عرفان اور اس کے مطابق زندگی کے رجحان اور میلان کا نام ہے۔ جس طرح طبعیات کے قوانین بلاامتیاز مذہب و ملت سب پر مساوی عمل کرتے ہیں، اسی طرح اخلاقیات اور روحانیت کے آئین بھی عالم گیر ہیں۔ اسلام کسی ایک قبیلے، کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کا مذہب نہیں، ریاضیات کی طرح اس کی صداقتیں بھی کائنات کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔'' ۱۸

اقبال کا نظامِ اخلاق اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ عالم گیر بھی ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک وہی اقدار و روایات اعلیٰ زندگی کی نمائندہ ہیں جو دنیا کے دیگر بڑے مذاہب میں بھی عزت و آبرو کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ وظیفہ فن کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نظیرات کا جمالیاتی حسن اور عالمگیریت برقرار رکھی جائے، کیوں کہ تجربے کو احساس، فکر کو جذبہ اور شعور کو اسلوب بنا دینے کا نام ہی شاعری ہے۔ جیسا کہ عمیق حنفی نے کہا ہے:

''عصری آگہی، انسان کے مادی، سماجی، اخلاقی، سیاسی مسائل کو شاعری کا موضوع اور مواد بنانا حرام نہیں، بلکہ مکروہ بھی نہیں ہے۔ شرط صرف تجربے کو احساس بنانے اور ایسا کر دینے کی ہے کہ شاعری ہضم کر سکے، پچاس سکے اور اپنا حصہ بنا سکے۔ شعر میں شعور کا رنگ الفاظ پر اور اسلوب پر حاوی رہے تبھی وہ شعر کہلانے کا مستحق ہے۔'' ۱۹

اقبال کے ہاں مذکورہ بالا تمام موضوعات کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے لیکن ان کا اخلاقی پہلو اتنا نمایاں ہے کہ اس کو تمام فکری مواد کا مرکز ماننا پڑتا ہے۔ اخلاقی فضائل کی متعدد اقسام ہیں، جن میں ایجابی اور سلبی اقدار شامل ہیں۔ ایجابی اقدار میں عزتِ نفس، خودداری، آزادی، حق گوئی، عزم و استقلال، جدوجہد، بہادری، غیرت و حمیت اور سلبی اقدار میں زہد، توکل، قناعت، تواضع، عاجزی، خاکساری، عفو، درگذر، حلم اور بردباری

شامل ہیں۔ اسی طرح ایجابی انفرادی اور ایجابی اجتماعی اقدار، سلبی انفرادی اور سلبی اجتماعی اقدار کی تقسیم بھی کی جاسکتی ہے۔ اقبال کے ہاں ایجابی و سلبی دونوں قسم کی اخلاقی اقدار پائی جاتی ہیں۔

انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، جب کہ باقی ساری کائنات کو انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ انسان کا کام ہے کہ اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو استعمال کر کے تسخیر کائنات کا کردار ادا کرے۔ علامہ اقبال مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے اپنے اندر موجود صلاحیتوں کو استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے، جب کہ خودی اس کو استعمال کرنے کا نام ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[۲۰]

اسی بات کی وضاحت ہمیں قرآن میں اس انداز سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ. (الحشر:۱۹)

''اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھلا بیٹھے، پھر اللہ نے اُن کی جانوں کو ہی اُن سے بھلا دیا (کہ وہ اپنی جانوں کے لیے ہی کچھ بھلائی آگے بھیج دیتے)۔''

اللہ کو بھول جانے کا نتیجہ نسیانِ ذات ہے۔ یہ نسیانِ ذات تقاضا ہائے حیوانیہ کا نسیان ہے نہیں؟ یہ تقاضا ہائے جسمانیہ کا نسیان ہے نہیں؟ تو نسیان سے یہاں مراد کیا ہے؟ فرمایا: تقاضا ہائے روحانیہ، حقیقتِ باطنیہ اور اخلاقیہ کا نسیان ہے۔ مفہوم مخالف عرفان ذات ہوا۔ عرفان ذات، تشکیل ذات ہے، تشکیل ذات تعمیر اخلاق ہے۔

انسان کے اعمال کی بنیاد نظریہ پر ہوتی ہے۔ نظریہ دراصل عمل کے لیے نہ صرف حرکت و عمل کا باعث بنتا ہے۔ جیسی سوچ اور فکر ہوگی ویسا ہی عمل تخلیق ہوگا، اور عمل ہی انسان کی نیک نامی یا بدنامی ارترقی یا تنزلی کا سبب بنتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے[۲۱]

خودی کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں[۲۲]

اقبال کم زوری، لاچاری اور بے بسی کو کسی صورت بھی گوارا نہیں کرتے کیوں کہ یہ تمام تر کیفیات عظمت انسانی کے منافی ہیں۔ اقبال عظمت و بزرگی کا ایسا معیار رکھتے ہیں جو انسانوں کے لیے نمونہ بن سکے اور وہ معیار ہے جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات وحیات کا آپؐ کامل ترین انسان ہیں، آپؐ کی عظمت سے زیادہ کسی کی عظمت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے آپؐ کا اسوہ تا ابدی نوع انسان کے لیے اعلیٰ نمونے، مثال اور معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال خود بھی عشقِ رسول سے سرشار تھے اور چاہتے تھے کہ انسان عظمت کے انتہائی معیار کو حاصل کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلیں اور آپؐ کا اسوہ حسنہ اپنائیں۔

تعمیر خودی

انسانی شخصیت اور کردار سازی کے لیے علامہ محمد اقبالؒ نے خودی کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ تصور انسانی شخصیت کی پہچان کے لیے بھی ہے۔ جب انسان اپنی خودی کو پہچان لیتا ہے تو وہ زندگی کے حقیقی نصب العین سے بھی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ہر فعل اس کی خودی کے تابع رہتا ہے، کیوں کہ خودی اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ اس کائنات رنگ و بو میں اپنا اظہار چاہتی ہے۔ اس کی اصل روح روحانی ہے، اقبال فرد کی ترقی کے لیے خودی کی ترقی اور تربیت پر زور دیتے ہیں، کیوں کہ اس کی تربیت انسان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔

علامہ اقبال خودی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین نفی نہیں بلکہ اثبات خودی ہے۔ یہ نصب العین صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان زیادہ سے زیادہ منفرد اور یکتا بن جائے۔ انسان کے اندر حیات کا مرکز خودی یا شخصیت ہے۔ شخصیت کشاکشی کی ایک کیفیت کا نام ہے اور اس کیفیت کی بقا سے ہی وہ قائم رہتی ہے۔ ہر وہ شے جو اس کیفیت کشاکش کے بقا میں معاون ہو ہمیں غیر فانی بنانے میں مددگار بنتی ہے۔ خودی کے اس تصور سے اقدار کا معیار قائم ہوجاتا ہے اور نیکی و بدی کا معمہ بھی حل ہوجاتا ہے۔ ہر وہ شے جو خودی کو مستحکم بنائے خیر ہے اور جو کمزور کرے شر ہے۔ آرٹ، مذہب، اخلاق سب کو خودی کے معیار ہی سے جانچنا چاہیے۔[۲۳]

اقبال کے نزدیک قوم کی زندگی کا انحصار وارتقاء کسی مصنوعی شیرازہ بندی پر نہیں، بلکہ افراد کی ذہنی اور جسمانی نشوونما پر ہے۔ جب تک کسی قوم میں جواں دل اور آزاد مرد پیدا نہ ہوں، جو اپنے دل کی گہرائیوں اور اپنے دماغ کی جولانیوں سے قوم کو نئے تصورات سے روشناس کرائیں اور تمدن کی بدلتی ہوئی ضروریات سے ہم آہنگ ہونے کا نیا اسلوب مہیا کریں، اس وقت تک اس قوم کے ارتقائی منازل طے کرنے کے امکانات نہیں۔[۲۴]

خودی کی وجہ سے انسان میں استقلال، استقامت او مداومتِ عمل پیدا ہوتی ہے۔ اعتراضات، مخالفتوں کے باوجود وہ اپنی سوچ وفکر کو عام کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند[۲۵]

اقبال کا فلسفہ خودی انسان کی معرفت فی النفس کا دوسرا نام ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنا اور اپنے آپ کو عزت دینا، ترقی دینا، اپنی عزت نفس کی حفاظت کرنا اور اپنے تخیل کو بلند کرنا ایک فرد کی تربیت ہے۔ قوم افراد کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر قوم کی اکائی کی

اصلاح کردی جائے تو پوری قوم کی اصلاح ممکن ہے۔ علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی انسان کی نفسیاتی تربیت کرتا ہے اور فرد کو اس دنیا میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ ہر دور کے انسان کو زندگی میں کام یابی و کام رانی کے لیے حوصلہ اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی انسان کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

تطہیرِ خودی

خودی کی جو کیفیات ہمارے سامنے آتی ہیں ان میں سے ایک معرفتِ نفس انسانی ہے، جس کو ہم تعمیر خودی بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب انسان اپنے نفس کو پہچان لیتا ہے تو پھر اس کی تطہیر کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اس میں جتنے رذائل ہیں ان کو ختم کیا جا سکے اور اخلاق حسنہ کو ان کی جگہ دی جا سکے۔اس کے نتیجے میں انسان سے جو اعمال انجام پاتے ہیں ان کو اقدار کا نام دیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں اخلاقی اقدار کی قدر و منزلت ہے، جس کو اقبال نے بھی اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے۔

اقبال مغرب کی مادی ترقی اور اخلاقی بے راہ روی کو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سمجھتے ہیں اور ملت اسلامیہ کے مسائل کا حل دانش مشرق اور حکمت قرآنی میں تلاش کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں انسان نے فلسفہ ودانش سے زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کر لی ہیں، لیکن روح کے گوہر مقصود کو نہیں پا سکا۔ ان آسائشوں میں کھو کر انسان خود صحت مند ہوتا چلا گیا اور عرفانِ ذات حاصل نہ کر سکا اور عشق کی قوت تسخیر سے محروم رہا۔

عشق ناپید وخرد می گردش صوتِ مار
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا[۲۶]

اسرار خودی کے دیباچے میں اقبال لکھتے ہیں:

''اخلاقی اعتبار سے افراد وقوم کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال یعنی خودی کیا ہے، کے جواب پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکما وعلما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو''۔ ۲۷

خودی کی جدوجہد کا انجام شخصیت کی تحدید سے چھٹکارا نہیں، بلکہ تخلیقی عمل ہوتا ہے، جو خودی کے وجود کو مستحکم کرتا ہے اور اس خیال سے اس کے ارادے کو تیز کرتا ہے، تاکہ اس دنیا کو صرف عقائد اور عمل کے ذریعے بدلا اور بنایا جاسکے۔ گویا خودی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس سے انسانی نفس کی تطہیر ہوتی ہے اور جب انسانی دل پاک وصاف ہو جائے تو پھر اس کا ہر عمل بھی پاک ہو جاتا ہے اور اسی پاکیزہ عمل سے اخلاقی اقدار جنم لیتی ہیں۔

اقبال کے فلسفۂ خودی کا مقصد انسان کو اپنی آزادانہ خودی، عزت نفس اور شخصیت سے آگاہ کرکے کارزار حیات میں لانا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اسے اپنی پہچان ہونا ہے۔ اقبال کے نزدیک اگر انسان اپنی خودی کا ادراک کرلے تو وہ نہ تو کسی کے سامنے جھک سکتا ہے اور نہ غلام رہ سکتا ہے۔ خودی کے تصور کی بنا پر وہ بوسیدہ روایات اور عقائد کے بتوں کو پاش پاش کردیتا ہے۔ پست ہمتی اور غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر فکر وعمل کو نئے ماحول اور ضروریات کے مطابق ترتیب دینے کا گُر جان لیتا ہے۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر وہ تہذیب وتمدن کے مصنوعی تفاخر، تخصیص اور عدم مساوات کو بدل کر خواجہ ومزدور، حاکم ومحکوم، محمود وایاز، بندہ وبندۂ نواز کی تمیز کو مٹاتا ہے۔ خالق ومخلوق میں ایک نیا رشتہ قائم کرکے دنیا میں ایک ایسی انسانی برادری قائم کرتا ہے جو قوائے فطرت پر فتح کرسکے اور اس کرۂ ارض کو جنت ارضی میں تبدیل کرسکے۔

انسانی اخلاق کے مظاہر فکر اقبال میں

اخلاق کا تعلق انسانی کردار، اطوار اور تہذیب سے ہوتا ہے، اس لیے انسان اپنے ہر اس فعل میں اس کا مختلف انداز میں اظہار کرتا ہے۔ پھر اسی کیفیت سے انسانی

شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔ گویا ہر انسان مختلف مظاہر سے اپنے اخلاق کا اظہار کرتا ہے۔ان مظاہر کو ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ا۔شائستہ گفتگو

انسانی شخصیت کی پہچان اس کے طرز تکلم اور گفتگو سے ہوتی ہے۔ گفتگو میں لب و لہجہ، الفاظ کا انتخاب اور موقع محل کے اعتبار سے گفتگو کرنا انسانی شخصیت کا خاصا سمجھا جاتا ہے۔شائستہ گفتگو انسانی اخلاقی اقدار کی بنیاد تصور کی جاتی ہے، کیوں کہ کسی بھی شخص کی پہچان اس کی گفتگو سے ہوتی ہے اور انداز گفتگو سے ہی شخصیت کا تأثر قائم ہوتا ہے۔اسی کی وضاحت اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے۔

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل پاک باز ۲۸

۲۔شرم وحیا

آداب زندگی کا جزو بنانے کے لیے حیا کی عادت معاشرتی پاکیزگی کی نشوو ارتقاء اور گھریلو زندگی میں بھی ماحول کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

إن الله عزوجل، إذا أراد ان يهلک عبدا نزع منه الحياء۔ ۲۹

''اللہ عز و جل جب اپنے کسی بندے کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتاہ تو اس سے حیا نکال لیتا ہے۔''

علامہ اقبالؒ بھی اپنے دل میں ایک تڑپ رکھتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ مسلم معاشرہ کیسے مغربی تہذیب کی چمک دمک سے متاثر ہو رہا ہے اسی لیے وہ فرماتے ہیں۔

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سردارا ۳۰
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے ۳۱

۳۔سوز و گداز

انسانی شخصیت اور کردار سازی کے سلسلے میں علامہ اقبال جو احساس رکھتے تھے کہ انسانی شخصیت کیسی ہونی چاہیے؟ اور اس میں اخلاقیات کا کتنا عمل دخل ہونا چاہیے اس کی طرف وہ بار بار توجہ دلاتے ہیں۔فرماتے ہیں۔

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی ہو نہ سکا[۳۲]
اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی پیچ و تاب رازی کبھی سوز و ساز رومی[۳۳]

۴۔نسلی امتیازات کا خاتمہ

اقبال نے امت مسلمہ کو یہ درس دیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ذات پات اور رنگ نسل، خون سے ماوراء اور پاک ہے اسی طرح امت مسلمہ کو بھی نسلی امتیازات سے پاک ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ روئے زمین پر اللہ کی حجت، نمائندہ اور پیغامِ رسول کی داعی اور امین ہے۔فرماتے ہیں

قوم تو از رنگ و خوں بالااست
قیمت یک اسودش صد احمر است[۳۴]

اے مسلمان تیری قوم رنگ و خون سے بہت اونچی ہے،مسلمان قوم کے ایک سیاہ شخص (حضرت بلالؓ) کی قدر و منزلت سینکڑوں گوروں اور سرخ رنگ والوں سے زیادہ ہے۔

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر[۳۵]
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز[۳۶]

رنگ و خوں کا امتیاز نسل انسانی کے لئے سوہانِ روح ہے۔نسل پسندی، رنگ پسندی،

قومی برتری، ذاتی فوقیت اور برتریٔ دولت نے تاریخ آدم پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔ خون کی ہولی کھیلی گئی اور دریا بہائے گئے۔

اقبال کا یہ شعر قرآن حکیم کی اس آیت کی تشریح کرتا ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

معلوم ہوا کہ کسی شخص کا کوئی مقام، مرتبہ یا عہدہ اس کو کسی بھی لحاظ سے فضیلت نہیں دیتا، کیوں کہ پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ لہٰذا وہ مساوی حقوق کے مالک ہیں۔ کسی شخص کو برتر سماجی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

حواشی

۱۔ مصطفیٰ شمس الدین، انوار اللغات واز بار الکلمات، جامعۃ الاسکندریہ، ج۱، ص۲۹۳
۲۔ امام غزالی، احیاء علوم الدین، مترجم محمد احسن صدیقی، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۹ء، ج۳، ص۳۹
۳۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ البالغہ، مترجم خلیل احمد، اسلامی اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء، ص۲۵۴
۴۔ امام مسلم، الجامع الصحیح، باب تفسیر البر والاثم، حدیث نمبر ۲۵۵۳
۵۔ مولانا حفظ الرحمٰن، سیوہاروی، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، فاروقی پریس دہلی، طبع دوم ۱۹۵۰ء، ص۱۶
۶۔ حوالہ سابق، ص۲۰
۷۔ مولانا حفظ الرحمٰن، سیوہاروی، اخلاق اور فلسفہ اخلاق، ص۲۴
۸۔ امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات ھل یصلی علیہ، حدیث نمبر ۱۳۵۸

۹۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، سیوینتھ سکائی پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۷۹۔۸۰

۱۰۔ امام بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب فضل من استبرا الدینۃ، حدیث نمبر ۵۲

۱۱۔ شاہ ولی اللہ، البدور البازغۃ، ص ۹۵

۱۲۔ سعید احمد رفیق، اقبال کا نظریہ اخلاق، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:

۱۳۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۳۵۵

۱۴۔ عزیز احمد، اقبال، نئی تشکیل، گلوب پبلیشرز لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۴

۱۵۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، مکارم اخلاق اور اقبال، مشمولہ: اقبال ۸۴، مرتبہ: ڈاکٹر وحید عشرت، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۶۸ء، ص ۳۵۲۔۵۳

۱۶۔ محمد اقبال، کلید کلیات اقبال، رتبہ: احمد رضا، ادارہ اہل قلم لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۷۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۴۶

۱۸۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور طبع ششم، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۲

۱۹۔ عمیق حنفی، شعر چیزے دیگر است، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۳ء، ص ۴۳

۲۰۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴۳

۲۱۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص ۴۶۰

۲۲۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص ۸۷

۲۳۔ محمد اقبال، اقبال نامہ، مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، ص ۳۷۰

۲۴۔ محمد اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مترجم: نذیر احمد نیازی، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۳ء، ص ۲۳

۲۵۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۳۴۵

۲۶۔ ضرب کلیم، ایضاً، ص ۶۹

۲۷۔ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص ۵۴

۲۸۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (بال جبریل، مسجد قرطبہ)

۲۹۔ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب الحیاء، حدیث نمبر ۴۱۸۳

۳۰۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (ارمغان حجاز)

۳۱۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (بانگ درا)

۳۲۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، بانگ درا، ص ۱۹۰

۳۳۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، بالجبریل، ص ۲۷۸
۳۴۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، رموز بیخودی، ص ۲۴۶
۳۵۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، بانگ درا
۳۶۔ علامہ محمد اقبال، شکوہ

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کے منصوبہ کے تحت تیار کردہ

دو اہم مطبوعات

۱۔اسلامی معاشرہ کی خصوصیات مولانا کمال اختر قاسمی

اس کتاب میں تین ابواب ہیں: پہلا باب مغربی معاشرہ اوراس کے اثرات ونتائج پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں ہندوستانی سماج کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پیسار باب اسلامی معاشرہ پر ہے۔ اس میں اسلامہ معاشرہ کی تشکیلی بنیادوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اوراس کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:۲۰۸ قیمت:۱۵۵

۲۔توحیداور قیامِ عدل مولانا محمد جرجیس کریمی

توحید کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے،جس پر ایمان لانے سے انسانی زندگی میں نظم،توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے اوراس پر ایمان نہ لانے سے وہ بدنظمی ، بے اعتدالی اور فساد کا شکار ہو جاتی ہے۔

پیش نظر کتاب چار مباحث پر مشتمل ہے،جن میں عقیدۂ توحید کی وضاحت کی گئی ہے،انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اعتدال وتوازن کے اثرات بیان کیے گئے ہیں، نیز عقیدہ توحید سے محرومی اور شرک والحاد میں آلودگی کے نقصانات اور افکار و خیالات پر پڑنے والے اثرات کا عالمانہ جائزہ شامل ہے۔

صفحات:۹۲ قیمت:۵۰

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز نئی دہلی 110025

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ 202002

قبول اسلام کا موجودہ رجحان اور اس کے اسباب

—————— مولانا محمد انس فلاحی مدنی

اسلام غور وفکر اور دلیل کی بنیاد پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور ایمانیات کے ضمن میں عقل انسانی کی تسلّی کے لیے آفاق وانفس کے دلائل پیش کرتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ، تعقلون، تبصرون، تذکرون جیسے الفاظ کے ذریعے غور وفکر پر ابھارا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی شخص، گروہ یا قوم کو مسلم حکم رانوں اور مسلمانوں نے زور بردستی یا لالچ دے کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہو۔ اسلام تو دراصل اپنے ہمہ گیر نظام حیات، فطری تعلیمات، عقل انسانی کو اپیل کرنے والی ہدایات اور مسلمانوں کی اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے صحراء عرب سے نکل کر براعظم ایشیا وافریقہ کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلا ہے۔

سازشیں، لیکن مثبت نتائج

صلیبی جنگوں (آغاز ۱۰۹۶ء) میں شکست کھانے کے بعد عیسائیت نے اسلام کی تصویر کو بگاڑنے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے 'استشراق' کا آغاز کیا۔ 'تحریک استشراق' کا بنیادی مقصد اسلامی احکام وتعلیمات کی شبیہ بگاڑنا تھا۔ مستشرقین نے اسلامی علوم وافکار پر شب خون مارنے کے لیے گہرا مطالعہ کیا، اسلامی احکام میں جب کسی طرح کا سقم نہ مل سکا تو انھوں نے بددیانتی کی راہ اپنائی، اپنے خود ساختہ نظریات کے مطابق اسلامی علوم کی ترجمانی شروع کردی۔ مستشرقین اپنے مقصد میں بہت زیادہ کام یاب نہ ہوسکے، البتہ انھوں نے اسلامی دنیا میں مسلم شاگرد ضرور پیدا کردیے، جو ان ہی کے نہج پر اسلامی علوم وافکار کی تعبیر وتشریح کا

کام کررہے ہیں اور مسلم ذہنوں میں اسلام کے تعلق سے تشکیک وتذبذب پیدا کرنے کی مذموم کوششیں کررہے ہیں۔

استشراق کی حقیقت بے نقاب کرنے میں اسلامی مفکرین اور مسلم علماء ودانش وران نے جی جان سے محنت کی۔ استشراقی تحریک اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل نہ کرسکی تو گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں 'تہذیبوں کا تصادم'کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اس نظریہ کے مبلغ سیموئل پی ہینگٹن (Semoil P watington) نے یہ تصور پیش کیا کہ مغربی تہذیب کو اگر کسی سے خطرہ ہے تو وہ اسلام ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ۹/۱۱ کا ڈرامہ رچا گیا تاکہ اسلام اور مسلمانوں پر حملے کا جواز بن سکے، پھر اسلاموفوبیا کا دور دورہ شروع ہوا۔

اسلاموفوبیا کے عنوان سے پوری دنیا میں اسلام مخالف مہم شروع ہوئی۔ اسلام کو دہشت گرد مذہب ثابت کرنے کے لیے جنگی پیمانے پر کوششیں ہوئیں۔ اس کے لیے بے تحاشا دولت صرف کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ امریکہ کے ایک تحقیقی ادارے 'سنٹر فار امریکن پروگریس' کی جانب سے ۲۶/ اگست ۲۰۱۱ء کو امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوششوں کے جائزے پر مشتمل ایک رپورٹ Fear,Inc.The Roots of Islamophobia Network in America سے ہوتا ہے۔ اس میں مستند معلومات کی بنیاد پر انکشاف کیا گیا ہے کہ امریکہ میں لکھنے والوں اور اس حوالے سے متحرک ایک گروپ نے پچھلے عشروں میں اسلام کے حوالے سے خوف کے جذبات فروغ دینے کے لیے دسیوں لاکھ ڈالر خرچ کیے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سات رفاہی گروپوں کی جانب سے تقریباً ۴۳ ملین ڈالر مسلم مخالف مہمات چلانے کے لیے فراہم کیے گئے۔[۲]

اسلاموفوبیا کے اثرات پوری دنیا پر تیزی سے پھیلے، اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے زاویۂ نظر تبدیل ہوا۔ اسلام کو دہشت گردی کو فروغ دینے والا مذہب سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ مغرب کی اس مہم نے مسلمانوں کے تعلق سے دنیا کو خوف میں مبتلا کردیا۔ لیکن اسی شر سے خیر نمودار ہوا۔ چنانچہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے تجسس پیدا ہوا۔

دنیا یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی کہ کیا مسلمان واقعی دہشت گرد ہیں؟ کیا اسلام دہشت گردی کو فروغ دیتا ہے؟ چنانچہ اس مہم سے مغرب میں مطالعۂ اسلام کا سفر پوری آب وتاب کے ساتھ شروع ہوا۔ مغرب میں مسلمانوں کے اعداد وشمار اور قبول اسلام کے تعلق سے سروے اور جائزے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اسلام وہاں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ مغرب ہی نہیں، اب اسلام دنیا میں سب سے زیادہ قبول کیا جانے والا مذہب بن چکا ہے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس کی فطری اور آفاقی تعلیمات کا نتیجہ ہیں۔

دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ورلڈ ریلیجن ڈاٹا بیس کے مطابق اس وقت عیسائیت دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، جس کے ماننے والوں کی تعداد 2.38 بلین ہے، جب کہ اسلام کو ماننے والوں کی تعداد 1.91 بلین ہے ؛لیکن ۲۰۵۰ء تک اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔[۳]

ایک رپورٹ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۸۴ء مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافے کی شرح کو ظاہر کرتی ہے:

عیسائیت	۱۳۸فی صد اضافہ
بدھ مت	۶۳فی صد اضافہ
ہندو مت	۱۱۷فی صد اضافہ
یہودیت	۴فی صد کمی
اسلام	۲۳۵فی صد اضافہ

ایک سروے کے مطابق دین اسلام کی مقبولیت کی موجودہ صورت حال کچھ یوں ہے:

> ''اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہے کیوں کہ دنیا کا کوئی ملک بھی ایسا نہیں جہاں کوئی نہ کوئی مسلمان آباد نہ ہو'' اسلام کی اشاعت کے نتیجے میں مسلمان معاشرے اور مسلمان اقلیتیں اب کئی علاقوں میں آباد ہیں

اور ایک ایسی قوت کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا میں ۴۰ فی صد سے زائد مسلمان اقلیتوں کے طور پر ہیں۔مغرب میں اسلام کا مستقبل مسلمانوں کے مستقبل کو بالخصوص اور انسانیت کے مستقبل کو بالعموم متاثر کرے گا کیوں کہ اسلام یوروپی ممالک کا دوسرا سب سے زیادہ وسعت پذیر دین بن چکا ہے۔''[۴]

امریکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی شرح کے بارے میں مسٹر سمیع باغل (Sami Baaghil) نے لکھا ہے: ''ایک اندازے کے مطابق ہر سال تقریباً پانچ ہزار (۵,۰۰۰)امریکی اسلام قبول کرتے ہیں۔ایڈسن (Edison) کی طرح ان میں سے اکثر افریقی ہیں۔نیو یارک کی نیشنل کونسل آف اسلامک افیئرز کے ترجمان محمد مہدی کہتے ہیں کہ ان میں سے کئی لوگوں کا خیال ہے کہ جب ان کے آباء واجداد کو یہاں لاکر بسایا گیا تو اس وقت وہ مسلمان تھے۔''[۵]

۴ر جنوری ۲۰۱۱ء کو برطانوی روزنامہ انڈی پنڈنٹ میں'' برطانیہ کی اسلامی صورت گری: غیر معمولی تعداد کا قبول اسلام'' : The Islamicfication of Britain record numbers embrace Muslim Faith کے عنوان سے شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ'' پچھلے دس سال میں برطانیہ میں مسلمان ہونے والے انگریزوں کی تعداد دگنی ہوگئی ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ'' اس کے باوجود کہ اسلام کو اکثر منفی انداز میں پیش کیا جاتا ہے، ہزاروں برطانوی ہر سال اسلام قبول کررہے ہیں۔''[۶]

غرض یہ اعداد وشمار کا ایک سرسری جائزہ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے ایشیا، افریقہ، امریکہ اور یورپ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ تحریک استشراق اور اسلاموفوبیا کی مہم کے مذموم مقاصد اسلام کی قوت اور طاقت روکنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔

قبولِ اسلام کے اسباب

(ا) دینِ فطرت

اسلام آفاقی دین ہے اور اس کی تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ حلال وحرام کے حدود، جائز وناجائز کے معاملات پر عمل آوری انسان کے لیے ذریعہ نجات ہے۔ اس میں انسان کے فطری اور بشری تقاضوں کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ اس کی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے نکاح جیسے پاکیزہ عمل کا حکم دیا گیا ہے۔ مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تجارت پر ابھارا گیا ہے۔فرد کے ذاتی حقوق کو تسلیم کرنے کے ساتھ اس پر اجتماعی ذمہ داری اور فرائض بھی عائد کیے گئے ہیں، تاکہ فرد کے ارتقاء کے ساتھ مثالی معاشرے کی تشکیل ہو سکے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب حقوق کے ساتھ فرائض کی بجا آوری کو بھی عین حق سمجھا جائے۔ معاشرے میں ظلم وجور کے خاتمہ کے لیے ظالم کا ہاتھ پکڑنے اور مظلوم کو سہارا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔کم زور اور بے سہارا افراد کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے زکوٰۃ وانفاق کی ادائیگی پر ابھارا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تعلیمات غیر مسلموں کے لیے وجہِ کشش بنتی ہیں۔

(۲) محفوظ ماخذ دین

دوسری وجہ کشش اسلام کے ماخذ ہیں۔ اسلام کی بنیاد جن دو ماخذ (قرآن و سنت) پر ہیں وہ صدیوں سے محفوظ ہیں۔ ان کی تعلیم وتدریس، تحفیظ وتبلیغ کا سلسلہ عرصہ سے جاری ہے۔ دوسرے مذاہب کے مآخذ اصلی شکل میں محفوظ ہیں، نہ ان کی تعلیم و تدریس کا کوئی نظام پایا جاتا ہے۔ بلکہ ان میں غیر معمولی تبدیلی ہو چکی ہے۔لیکن اسلامی شریعت کی اساس جن ماخذ پر ہے وہ روزِ اوّل سے محفوظ ہیں۔ان کی بنیاد پر اسلامی علوم کی تشکیل ہوئی ہے۔ نیز اسلامی شریعت میں زمانے کے تقاضے اور حالات کے مطابق انسانی مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ اسلامی مآخذ انسانی زندگی کے جملہ شعبوں سے بحث کرتے ہیں، دیگر مذاہب میں انسان کو کچھ روحانی اور اخلاقی تعلیمات تو ضرور دی گئی ہیں۔لیکن اس کی مادی ضرورتوں کا مکمل نقشہ

موجود نہیں ہے۔ اسلام کی یہی خوبی غیر مسلموں کو اسلام کی طرف بڑھنے پر تیزی سے مجبور کر رہی ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مثالی کردار

تیسری وجہ کشش رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مثالی کردار ہے۔ آپؐ کی سیرت کا ہر جز اپنی مکمل تفصیلات کے ساتھ موجود ہے۔ انسانی تاریخ میں آپؐ کی شخصیت کا ریکارڈ جتنی تفصیل اور واضح انداز میں موجود ہے، اس سے پہلے نہ کسی کا لکھا گیا ہے اور نہ لکھا جا سکتا ہے۔ آپؐ کے خوشی و غم، سفر و حضر، طعام و قیام، امن و جنگ، نکاح و طلاق، گھریلو اور اجتماعی زندگی کا واضح نقشہ موجود ہے۔ نیز آپؐ کی شخصیت و کردار کے منفرد و امتیازی پہلو چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کی تکریم، بیواؤں، غلاموں اور کم زوروں کی دادرسی، مثالی خانگی و اجتماعی زندگی، یہ سب خصوصیات غیر مسلموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و کردار سے بہت متاثر کرتی ہیں۔ ان کی بڑی تعداد آپؐ کے حسن کردار و عمل سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتی ہے۔ ایک نومسلم ولیم بی بشیر پکارڈ (William B.Bashyr Pickard) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی کردار کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ”عظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کی محبت اور عقیدت کے جلو میں وصال فرمایا۔ آپؐ نے کفار مکہ کی جانب سے دی گئیں تکالیف اور مصائب کا مقابلہ غیر متزلزل استقامت اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ کیا۔ فتح مکہ کے تاریخی موقع پر آپؐ نے شکست خوردہ دشمنوں سے رحم و کرم کا سلوک کیا اور اپنی قوت اور خوش حالی کے عروج پر بھی سادگی، کفایت شعاری اور بڑے چھوٹے سب سے برابر رحم دلی کا مظاہرہ کیا۔“[۷]

(۴) مساوات

اسلام کی نگاہ میں مال و دولت، حسب و نسب اور جاہ و منصب انسانوں کے درمیان فرق مراتب کی بنیاد نہیں ہے۔ اس نے انسانوں کے درمیان عزوشرف کا صرف ایک پیمانہ مقرر کیا ہے، وہ ہے تقویٰ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَّأُنثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقٰكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات:۱۳)

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا، پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے ولا اور باخبر ہے۔''

اسلام تمام انسانوں کو آدم و حوا کی اولاد قرار دیتا ہے۔ اس میں رنگ و نسل اور جاہ و منصب کی بنیاد پر تفریق نہیں کی گئی ہے۔ عزو شرف کا معیار و مقام صرف اللہ کی بندگی ہے۔ دنیاوی حیثیت سے کم زور مومن بھی کسی صاحبِ ثروت شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ احترامِ انسانیت کی یہ تعلیم غیر مسلموں کے لیے کشش کی بڑی وجہ بنتی ہے اور وہ اس تصور اور نظریہ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے ہیں۔

(۵) حقوق نسواں

مغربی میڈیا اور سیکولر طبقہ مسلم خواتین کے تعلق سے یہ تصور پیش کرتا ہے کہ اسلام نے انھیں گھر کی چہار دیواری میں قید کر رکھا ہے۔ وہ آزادی کے ساتھ گھر سے باہر نہیں نکل سکتی ہیں اور نہ اپنی معاش کی بہتری کے لیے ملازمت یا کوئی کاروبار کر سکتی ہیں۔ مسلم خواتین پر اعتراض کے سلسلے میں پردہ، نقاب اور حجاب کو خصوصی نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میڈیا کا یہ پروپیگنڈہ بظاہر مسلم خواتین کے حقوق کی بازیافت کی صدا محسوس ہوتا ہے، لیکن اس کا اصل نشانہ اسلام ہوتا ہے۔ اس پروپیگنڈہ کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام نے خواتین کو عائلی اور سماجی زندگی میں آزادی نہیں دی ہے۔ وہ جن حقوق اور اختیارات کی مستحق ہیں، اسلام نے انھیں ان سے محروم کر رکھا ہے۔ مغرب اپنے یہاں بسنے والی خواتین کے بارے میں چنداں فکر نہیں کرتا۔ مغربی کلچر، روایت اور اخلاق باختگی کی وجہ سے جن کے وجود مسموم ہو چکے ہیں اور اب وہ

سکون وعافیت کی تلاش میں اسلام کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔

دراصل ان کے یہاں حقوق نسواں اور خواتین کی آزادی کا تصور یہ ہے کہ عورت ہر طرح کی قید و بند سے آزاد ہو اور ہر کسی کے لیے آزاد ہو۔ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہو۔ ہر وہ کام جو مرد کر سکتے ہیں، وہ عورت بھی کرے۔ آزادی کے اس تصور کے الم ناک نتائج سامنے آچکے ہیں۔ مغرب کا معاشرتی نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ سالانہ دس لاکھ سے زائد بچوں کے اسکول میں ایڈمیشن کے وقت ولدیت میں ماں کا نام ہی درج کیا جاتا ہے۔ خواتین اپنی جسمانی ساخت، صلاحیت اور طاقت سے زیادہ کام کے بوجھ کی تاب نہ لاکر اپنے اصل اور فطری دائرہ کار میں لوٹنا چاہتی ہیں۔ وہ تیزی کے ساتھ اس نظام سے بغاوت پر آمادہ ہیں اور اسلام کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ اسلام کا مطالعہ انھیں قبول اسلام پر آمادہ کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی خواتین کی قبول اسلام کی شرح مردوں سے زیادہ ہے۔ وہ اسلام کے عائلی نظام زندگی، مسلم خواتین کی معاشرت اور طرز زندگی سے متاثر ہو رہی ہیں۔

تین امریکی اسکالروں کی ایک مشترکہ تحقیقی تصنیف میں انکشاف کیا گیا ہے کہ مشرف بہ اسلام ہونے والوں میں عورتوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے، جب کہ ہر سال اوسطاً بیس ہزار امریکی مسلمان ہو رہے ہیں۔ قبول اسلام کے رجحان میں یہ نمایاں اضافہ نائن الیون واقعہ کے فوراً بعد رونما ہوا، جب اسلام کے بارے میں دل چسپی بڑھی۔ ان محققین کے مطابق، امریکیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اسلام قبول کر رہی ہے، جن میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب تقریباً ایک اور چار کی نسبت کا ہے۔[8]

خواتین کے قبول اسلام کی داستان ایک نومسلم امریکی خاتون کیرل ایل اینوے (Carol L.Anway) نے اپنی کتاب : Daughters of Another Path : Experiences of American Women Choosing Islam (دخترانِ راہِ دیگر : اسلام کا انتخاب کرنے والی امریکی عورتوں کے تجربات) میں تفصیل سے امریکی عورتوں میں اسلام کی مقبولیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کے اسباب بیان کیے ہیں۔[9] دس

ابواب پر مشتمل اس کتاب میں نومسلم خواتین کے تاثرات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں خواتین کا جو مقام و مرتبہ ہے اس سے انھیں حقیقی اطمینان حاصل ہوتا ہے اور وہی ان کے قبول اسلام کا سبب بن رہا ہے۔

(۶) معاشی ذمہ داری سے آزادی

اسلام نے عورت پر معاشی ذمہ داری عائد نہیں کی ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی محبت، عزت اور احترام کی مستحق ہے۔ مغربی خواتین اپنی پیشہ وارانہ زندگی اور ذمہ داری سے عاجز آچکی ہیں۔ ملازمت پیشہ زندگی ان کی صحت کو بہت بری طرح متاثر کرتی ہے۔ وہ اس لیے اسلام میں ہی عافیت محسوس کرتی ہیں۔

ایک امریکی نومسلمہ کہتی ہے: ''اسلام عورتوں کے لیے قید خانہ نہیں، جیسا کہ امریکہ میں برسوں سے سمجھا جاتا ہے۔ ہر شائستہ اور مہذب معاشرے کی طرح اسلام بھی معقول رہ نما خطوط اور قوانین رکھتا ہے، تاہم اسلام میں لچک ہے، جب کہ بعض دوسرے قوانین 'پتھر کی تحریر' کی طرح ہیں اور ان میں کسی بھی صورت میں کوئی رعایت ممکن نہیں۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ بعض لوگ، جو اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا چاہتے ہیں، کہتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں سے دوسرے درجے کا شہریوں والا سلوک کیا جاتا ہے، یا یہ کہ اسلام میں عورت، مرد سے کم تر سمجھی جاتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے شوہر اور بچوں کو کھانا کھلائے اور پھر جو کچھ بچ رہے وہ خود کھائے۔ یہ بات حقیقت کو بھونڈے طریقے سے مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ بعض اوقات عورتیں اپنے گھر کے دیگر افراد کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہیں، لیکن یہ کوئی سزا یا ان کے عورت ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف کسی فیصلے کا نتیجہ نہیں۔ مسلمان عورت ایسا اپنی محبت اور احساسِ ذمہ داری کے تحت کرتی ہے۔[۱۰]

(۷) خواتین کا دائرہ کار

ڈچ خواتین[۱۱] کے قبول اسلام پر ریسرچ کرنے والی کیرین وین نیووکرک (Karin van Nieuwkerk) کے نزدیک مغربی عورتوں میں اسلام کی مقبولیت کا بڑا

سبب ’’مردوں اور عورتوں کا الگ الگ دائرہ کار اور حقوق و فرائض کا وہ واضح تصور ہے جو اسلامی تعلیمات فراہم کرتی ہیں ۔ اسلام میں خاندان اور عورت کے مادرانہ کردار کا بڑا مقام ہے۔ یہاں عورتیں جنسی کھلونا نہیں ہیں ۔اسلام عورتوں کو ماں ، بہن ، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے جو عزت اور احترام دیتا ہے، مغربی معاشروں میں اس کا تصور نہیں ۔ اس جنس زدہ تہذیب میں عورتوں کے حقوق اور آزادی نسواں کے تمام دعووں کے باوجود عورت محض مردوں کا کھلونا ہے‘‘ ۔[۱۲]

(۸) معاشرتی نظام اور مساوات کی تعلیم

ایک امریکی نومسلمہ فاطمہ (چیکو سلوایہ) مسیحی نام ’مونیکا‘ اپنے قبول اسلام کا سبب ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں :’’میرے لیے سب سے زیادہ کشش اسلام کا معاشرتی نظام تھا ، جو بلا تمیز رنگ و نسل سب انسانوں کو برابری اور مساوات پر استوار ہے ۔ پھر روحانی و دنیاوی معاملات میں بے پناہ آسانی اور رخصت اور دونوں کے تقاضوں کو توازن واعتدال کے ساتھ انجام دینے کی ترغیب، علم و عقل کی یہ کارفرمائی کہ حصول علم مرد و عورت سب پر فرض کر دیا گیا ، پھر عورت کو جو بلند مرتبہ اور عزت و احترام دیا گیا ، اس سے میری روح جھوم جھوم اٹھی ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ اور انسانوں کے درمیان بلاواسطہ تعلق، ان سب چیزوں نے میرے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلسفی نہیں ۔ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں ۔ اسلام ان کے ذہن کی پیداوار نہیں ، بلکہ وحی الٰہی کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس کی طرف اللہ نے شروع سے راہ نمائی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے لیے حالات بہت سازگار ہیں ۔ اس میں ایک عالم گیر دین بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ اس دور کے انسان کی تمام روحانی و مادی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے ۔ دیکھنا یہ ہے اسلام کے پیروکار اس موقع سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں؟‘‘ [۱۳]

ایک امریکی نومسلم ایفورا ایویس کہتے ہیں کہ اس مذہب کی سب سے زیادہ دل چسپ اور پُرکشش بات میرے لیے یہ تھی کہ یہ ایک مکمل اور جامع نظام ہے ، جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہت سے مسائل کا حل پیش کرتا ہے ، دنیا اور آخرت کے درمیان

اعتدال قائم کرتا ہے اور ساری انسانیت کے اقتصادی اور معاشرتی ،اصلاحی منصوبوں کا ایک خاکہ اپنے اندر رکھتا ہے۔[۱۴]

اسلام قبول کرنے والے ہر طبقہ کے افراد ہیں ،کم زور ،خوش حال ،نوجوان، بوڑھے، سب اسلام کو راہِ نجات جان کر اسے قبول کر رہے ہیں ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی طرف قدم بڑھانے والوں کے لیے رائج زبانوں میں تیز رفتاری سے اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے، تا کہ وہ اسلام سے شعوری طور پر بھی وابستہ ہو جائیں۔ ایسے نومسلموں کی اسلامی تعلیم وتربیت وقت کی بڑی ضرورت ہے ۔موجودہ حالات میں ان کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟ اس کی منصوبہ بندی کرنا وقت کا تقاضا ہے ،اس پر اہل علم اور دانش ورانِ ملت کو غور وفکر کے بعد مناسب حکمت عملی طے کرنی چاہیے۔

حواشی ومراجع

ا۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب The Clash of Civilization and the Remaking of World Order میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ اس عنوان سے ۱۹۹۳ء میں Foreign Affairs نامی میگزین میں ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ بعد میں کتابی شکل میں مکمل کیا۔ اس کتاب کا مکمل اردو ترجمہ 'تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو' کے نام سے ڈاکٹر محمد شفیع خان شریعتی نے کیا ہے، جو ۲۰۱۳ء میں ملت پبلی کیشنز، حیدر پورہ شری نگر سے شائع ہوا۔ اس سے قبل تلخیص اور ترجمہ 'تہذیبوں کا تصادم' کے عنوان سے عبدالمجید طاہر نے کیا تھا، جو نگارشات پبلی کیشنز سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، سہ ماہی مغرب اور اسلام، ،اسلام آباد، شمارہ ۱/ ۲۰۱۲ء، ص ۲۳، ۲۴

۳۔ https://worldpopulationreview.com/

۴۔ محمد حنیف شاہد، اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟ دارالسلام، ریاض، ص: ۳۳

۵۔ حوالہ سابق، ص: ۳۴

۶۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، سہ ماہی مغرب اور اسلام، ،اسلام آباد، شمارہ ۱/ ۲۰۱۲ء، ص: ۱۷

۷۔ محمد حنیف شاہد، اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟ دارالسلام، ریاض، ص: ۱۰۳

۸۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، سہ ماہی مغرب اور اسلام، ،اسلام آباد، شمارہ ۱/ ۲۰۱۲ء، ص: ۱۷، ۱۸

۹۔ حوالہ سابق،ص:۶۶ ۱۰۔ حوالہ سابق،ص:۷۳

۱۱۔ ڈچ جرمانی نسل کے لوگ ہیں، انہیں ہولینڈی ،یا نیدر لینڈ بھی کہتے ہیں۔یہ نیدر لینڈ (Netherlands) میں رہتے ہیں۔ڈچ سوسائٹی میں اسلام تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔ اسلام وہاں چوتھا بڑا مذہب بن چکا ہے،مسلمانوں کی آبادی 5% کے قریب پہنچ چکی ہے۔

۱۲۔ حوالہ سابق،ص:۷۷

۱۳۔ پروفیسر ثریا بتول، جدید تحریک نسواں اور اسلام، منشورات، طبع دوم ستمبر ۲۰۰۰ء،ص:۴۴۲، ۴۴۳

۱۴۔ محمد ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ، اسلام کی آغوش میں، جامعہ دار السلام، عمر آباد، اپریل ۲۰۱۹ء، ص:۱۰۱

علم قراءت میں قاری طاہر رحیمیؒ کی خدمات

——————— جناب فضل الرحمٰن محمود

علوم قرآنی میں سے ایک اہم علم 'علم قراءت' ہے۔ابتدا سے اب تک اس علم کے ماہرین نے اپنے ذوق اور طاقت کے مطابق قرآن مجید کی خدمت میں حصہ لیا ہے اور علم قراءت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔انہی میں سے ایک نمایاں شخصیت قاری طاہر رحیمی کی ہے۔ان کا نام ان نمایاں شخصیات میں شامل ہے، جنہیں علمِ قراءت کے ساتھ فقہ و حدیث میں بھی مہارت حاصل تھی۔اس مقالے میں ان کی خدمات پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی۔

حالاتِ زندگی

آپ کا پورا نام محمد طاہر رحیمی بن حفیظ اللہ عرف اللہ رکھا اور کنیت ابوعبدالقادر ہے۔ ہندوستان کے مشہور شہر جالندھر میں ۱۳۶۰ھ/مطابق ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ گیارہ (۱۱) برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔۱۳۷۲ھ میں خیر المدارس (ملتان) میں قاری رحیم بخشؒ کے پاس قرآن حفظ کرنے کے بعد انہی کی خدمت میں رہ کر تیرہ (۱۳) برس کی عمر میں تجوید سیکھی اور مقدمۂ جزریہ، شاطبیہ اور دیگر قرأت یاد کیں۔۱۳۸۱ھ میں اسی مدرسے سے قرأتِ عشرہ کی سند حاصل کی اور ۱۳۸۴ھ میں چوبیس (۲۴) برس کی عمر میں دورۂ حدیث کا امتحان دے کر اعلیٰ درجے میں کام یاب ہوئے۔[۱] وفاق المدارس کے امتحان میں نمایاں نمبر پائے اور پاکستان بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔[۲] قراءت عشرہ (صغریٰ و کبریٰ) تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ میں انہیں مہارت حاصل تھی۔

تدریس

رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ ۱۳۸۴ھ میں جامعہ قاسم العلوم، ملتان میں

قرآن مجید اور علم قراءات کے استاد مقرر ہوئے، جہاں آپ نے ۱۴۰۲ھ تک تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ اس دوران میں آپ نے بہ یک وقت حفظ، تجوید وقرأت، تفسیر و حدیث اور بعض دیگر فنون کی کی تدریس کی۔ آپ کے زیر تدریس درج ذیل کتابیں رہیں: ترجمۂ قرآن، فصول اکبری، فارسی کتب، علم الصیغۃ، کنزالدقائق، رشیدیہ، ملاحسن، شرح عقائد، مطوّل، بیضاوی، مشکوٰۃ، ابن ماجہ، موطا امام مالک، سنن ابوداؤد، صحیح مسلم، صحیح بخاری کا کچھ حصہ۔[۳]

مختلف علوم وفنون میں آپ کی مہارت کے سب معترف تھے۔ مولانا محمد زکریاؒ صاحب اوجز المسالک نے جب آپ کی کتاب زبدۃ المقصود فی حل قال ابوداؤد دیکھی تو فرمایا: ''کتاب دیکھ کر دل خوش ہوا اور میں نے اس کو اپنے بستر کے سرہانے رکھوایا ہے۔ اسے دیکھ کر ہی دل خوشی سے بھر جاتا ہے''۔[۴] قاری فتح محمد پانی پتیؒ، قاری محمد سلیمان (دہلی) کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''عزیزم مولانا مقری طاہر رحیمی، داماد، تلمیذ رشید، حقیقی جانشین قاری رحیم بخشؒ بعض علمی کمالات میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔ ماشاء اللہ کام میں خوب محبت، محنت، للّٰہیت سے لگے ہوئے ہیں۔ کافی کتابوں کے مؤلف ہو چکے ہیں۔ کچھ زیر تالیف ہیں۔ پاکستان بھر میں کام کا تو وہی ایک دانا نظر آتا ہے۔''[۵]

سنن ابی داؤد کے مشکل مقامات کے حل پر آپ کی کتاب 'زبدۃ المقصود' پر مفتی محمودؒ تبصرہ فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''قاری صاحب موصوف جہاں علم تجوید وعلم قراءات کے فن میں ماہر ومعتمد ہیں اور فن قراءات میں بیش بہا تصانیف کے مؤلف ہیں، وہیں علم حدیث کے مشکل مقامات کے حل میں بھی کافی دل چسپی رکھتے ہیں''۔[۶]

آپ کے استاد قاری رحیم بخشؒ فرماتے ہیں: ''پیارے عزیز، جناب قاری محمد طاہر سلّمہٗ، ماہر قرأتِ عشرہ وحافظ شاطبیہ ودرّہ وغیرہا وشارح النشر فی القرأت العشر، جن کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے خدمتِ قرآن وحدیث کے لیے ہی پیدا فرمایا ہے، آپ دسوں قرأت

اوران کے متداول قصائد شاطبیہ، درّہ، جزریہ کے جیّد حافظ اور عالم ہیں۔ تمام علوم خوب محنت سے پڑھے ہیں اور فنِ حدیث میں اتنی دست رس حاصل کی کہ وفاق المدارس کے امتحان میں نمبراوّل آئے اور نہ صرف اوّل آئے، بلکہ جب سے وفاق قائم ہوا ہے اس وقت سے لے کر اب (۱۳۸۵ھ) تک فائق الاقران کا لقب پایا، میرے پاس کم و بیش تیرہ (۱۳) سال گزارے ہیں، بحمد اللہ میں نے ان کو ہمیشہ علم وعمل کا جامع پایا، مجھے اور میرے شیخ محترم (قاری فتح محمد پانی پتی) کوفن قرأت اوران کی کتب میں ان پر پورا اعتماد ہے"۔ ے

حضرت موصوف کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عبادات کا خاص ذوق وشوق عطا کیا تھا، چناں چہ کثرت سے نوافل اور تہجد میں مسلسل قرآن کی تلاوت اور بہ کثرت روزے رکھتے۔ اسی طرح دورانِ تدریس مدرسہ میں جہری نمازیں حضرت کے سپرد تھیں۔ اسی طرح عام تلاوت کے معمول میں مختلف قرأت میں قرآن ختم کرلیا کرتے تھے۔

آپ کی خواہش تھی کہ مدینہ منورہ میں آپ کو قیام کا موقع ملے، وہیں آپ کا انتقال ہو اور جنۃ البقیع میں آپ کو دفن کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ خواہش پوری کردی۔ آپ نے کبھی حرم میں نماز پڑھنے سے کوتاہی نہیں کی۔ حتّیٰ کہ بیماری کی شدت میں بھی مسجد نبوی کی نماز نہیں چھوٹتی تھی۔ جب بیماری نے شدت اختیار کی اور اطباء اور احباب نے گھر پر ہی نماز پڑھنے پر اصرار کرنا شروع کیا تو آپ نے ان کی بات مان لی۔ لیکن فجر اور عشا کی نمازیں بہ دستور مسجد نبوی میں ادا کرتے رہے۔ جب چلنا پھرنا دشوار ہوگیا اور پیروں میں ورم آ گیا تو بھی نماز باجماعت کی اتنی فکر رہتی تھی کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا۔ جگر کا عارضہ ہوا تو سعودی عرب کے مشہور ہسپتال 'کنگ فہد' میں داخل کروایا گیا۔ وہاں بھی مایوسی کا اظہار کیا گیا اور علاج کے لیے چین جانے کی گزارش کی گئی۔ جہاں اس بیماری کا کام یاب علاج ممکن تھا، لیکن آپ نے مدینہ منورہ میں قیام کو ترجیح دی اور چین کا سفر کرنے سے انکار کردیا۔

اساتذہ

آپ کے اساتذہ میں درج ذیل علماء وفضلاء کے نام ملتے ہیں:

۱۔ حافظ عبد العزیز

۲۔ قاری محمد ابراہیم ہوشیار پوری

۳۔ حافظ محمد یاسین کرنالی

ان تین شیوخ سے آپ اوّلاً ناظرہ قرآن کریم پڑھا اس کے بعد حفظ کیا۔

۴۔ قاری رحیم بخش: ان سے علم تجوید میں تحفۃ الاطفال اور مقدمہ جزری، علم قرأت میں شاطبیہ، درّۃ، طیّبہ اور علم رسم وضبط کی کتابیں پڑھیں۔9

۵۔ مولانا محمد صدیق: ان سے علم صرف، نحو، منطق، جلالین، مشکوٰۃ المصابیح، قرآن مجید کے آخری سات پاروں کا ترجمہ، مؤطا امام محمد اور مؤطا امام مالک کا درس لیا۔

۶۔ علامہ محمد شریف کاشمیری: ان سے اصول فقہ میں مسلّم الثبوت، بلاغت میں مطول اور حدیث میں ابوداؤد اور سنن ترمذی پڑھی۔

۷۔ مفتی محمد عبداللہ: ان سے ہدایہ، صحیح مسلم اور سنن نسائی پڑھی۔

۸۔ مولانا خیر محمد: ان سے اصول حدیث میں نخبۃ الفکر اور حدیث میں صحیح بخاری پڑھی۔

مشہور تلامذہ

آپ نے پاکستان اور سعودی عرب (مدینہ منورہ) دونوں ممالک میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ اس لیے آپ کے تلامذہ میں عرب وعجم کی کثیر تعداد شامل ہے۔ چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

۱۔ قاری عبد القادر: یہ آپ کے فرزند ہیں اور آج کل سعودی عرب میں قیام پذیر ہیں۔

۲۔ الیاس احمد حسین البرماوی: انھوں نے آپ کو 'طیبہ' کے طریق سے روایتِ حفص میں، مدِّ منفصل میں 'قصر' کی رعایت رکھتے ہوئے مکمل قرآن مجید سنایا۔ اسی طرح کچھ اجزا روایتِ قالون وشعبہ میں بھی سنائے۔

۳۔ قاری عبدالسلام محمد حماد الادریسی: انھوں نے آپ کو عشرہ صغری میں سورۂ فاتحہ سے سورۂ فاطر تک قرآن مجید سنایا۔

۴۔ یوسف محمد شفیع: انھوں نے آپ کو 'طیبہ' کے طریق سے روایتِ حفص میں مکمل قرآن مجید سنایا۔

ان کے علاوہ الشیخ عدنان مرسی، انس عدنان مرسی، جمال سالم عامر الحارثی، ابراہیم جمال الحارثی، محمد سردار عبدالمؤمن، نعمت اللہ عبدالوہاب وغیرہم بھی آپ کے قابل ذکر تلامذہ میں شامل ہیں۔۱۰

وفات

آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ۲۹/جون ۲۰۰۸ء کو ہوئی اور جنت البقیع میں تدفین بھی عمل میں آئی۔

تصانیف

آپ کی کتابوں کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔۱۱ علوم القرآن اور فن قراءت میں آپ کی تصانیف کا تعارف آئندہ سطور میں کرایا جارہا ہے:

فضائلِ حفاظ القرآن

اس کتاب کا مکمل نام 'مفاتح الحجاز فی فضائل الحفاظ عرف قرآنی دائرۃ المعارف فضائل حفاظ القرآن مع علوم و قصص و اخلاق حملۃ القرآن' ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے: حصۂ اول میں فضائلِ قرآن سے متعلق پانچ سو سات (۵۰۷) احادیث اور حصۂ دوم میں قرّاء وحفاظ واہل قرآن کے تین سو بیس (۳۲۰) واقعات وحالات مذکور ہیں۔ علاوہ ازیں شروع میں ایک خلاصۃ الکتاب، مقدمہ اور آخر میں ایک ضمیمہ وخاتمہ ہے۔

مقدمہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، جس کے اہم مضامین یہ ہیں: حفظ قرآن کے اصول وآداب، ختمِ قرآن کی مدت، امام شاطبی کے حالات، قرآنی سورتوں کے خواص،

آسمانی کتابوں میں قرآن پاک کی امتیازی خصوصیات، قرآن مجید کے بائیس اسما کے معانی وتشریح، شروط علم وضوابط حفظ قرآن، اعداد وشماریاتِ قرآن۔

ضمیمۂ کتاب میں، تاریخِ قرآن وقرأت (تدوین وترتیب)، تاریخ خطوط و خطّاط قرآن، فضائل قرآن سے متعلق کچھ تقاریر اور خاتمہ میں چند وصیتیں اور نصائح مذکور ہیں۔ فضائل قرآن سے متعلق جو احادیث بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں۔

مصنف نے یہ کتاب نہایت محنت اور عرق ریزی سے مرتب کی ہے، جس کا اندازہ کتاب کے مندرجات، مصادر وماٰخذ اور مباحث کے تنوع کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ موضوع سے متعلق ہر بڑی چھوٹی کتاب سے استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک ہزار چھ سو چورانوے (۱۶۹۴) صفحات پر مشتمل یہ کتاب مصنف کے علمی کمالات کا مظہر، واقعات حفاظ واہل قرآن کا جامع مرقع، تاریخِ قرآن، عجائبات ومعجزاتِ قرآن، حاملین وخطاطین قرآن، فرائد ونفائس، فضائل سور القرآن اور تاریخ علم قرأت جیسے علوم و مباحث کا عمدہ ذخیرہ ہے۔

کمال الفرقان شرح جمال القرآن

جمال القرآن مولانا اشرف علی تھانویؒ کی علم تجوید پر ایک جامع اور مختصر کتاب ہے، جس میں اس فن کے ضروری مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کو ابواب یا فصول کے بجائے 'لمعات' میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کی تعداد چودہ ہے۔[۱۲]

اس کے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے اس کو ایک بہترین متن کا درجہ حاصل ہے۔ ہر زمانے میں اساتذۂ تجوید نے اس کی توضیح وتشریح کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ اس کی بیسیوں شرحیں اور حواشی لکھے جا چکے ہیں۔ قاری محمد طاہر رحیمی نے اس کی ایک مفصل شرح 'کمال الفرقان شرح جمال القرآن' کے نام سے مرتب فرمائی۔ یہ ایک ضخیم شرح ہے، جس میں تجوید کے تمام مضامین پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔[۱۳] جمال القرآن کی

شروح میں یہ سب سے عمدہ ہے۔ قاری فتح محمد پانی پتیؒ اپنے ایک خط میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عزیزی موصوف کے قلم سے حق تعالیٰ شانہ نے حضرت تھانویؒ کی 'جمال القرآن' کی شرح نہایت عجیب مرتب کرائی ہے اور نام بھی نہایت نفیس اور مناسب مقرر کیا ہے، یعنی 'جمال القرآن' کی شرح کا نام آپ نے 'کمال الفرقان' رکھا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ماشاء اللہ یہ شرح اسم بامسمّٰی ہے۔ اس کی خوبیوں کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ میرے قلم کو اتنی طاقت نہیں کہ اس کی خوبیوں کو آشکارا کرسکے، بلکہ میں تو اس کی تعریف کا حق ادا کرنے سے بھی قاصر ہوں''۔[۱۴]

شرح کی خصوصیات و اندازِ تالیف

اس شرح کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ ہر مضمون (قاعدہ، فائدہ اور تنبیہ) پر حاشیہ کا نشان دے کر بہ قدرِ ضرورت اس کی تفصیل کردی گئی ہے۔

۲۔ بعض 'لمعات' کے آخر میں ان کے مناسب بعض ضروری مضامین بہ عنوانِ 'تکملہ' درج کیے گئے ہیں۔

۳۔ ہر لمعہ کے شروع میں اس کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔

۴۔ ہر لمعہ کے آخر میں مختصر لفظوں میں اس کا جامع خلاصہ لکھا گیا ہے۔[۱۵]

۵۔ مسائلِ تجوید کا روایت و درایت دونوں اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۶۔ قواعدِ تجوید کی شرعی بنیادوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۷۔ ابواب کی مناسبت سے روایتِ حفص کے علاوہ دیگر ائمہ کی روایات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

شرح کے اخیر میں رسالہ تجوید القرآن (نظم) اور رسالہ یادگار حق القرآن

(نظم)، جن کے متعلق صاحبِ متن نے درسِ جمال القرآن سے قبل یاد کرنے کا مشورہ دیا ہے، ان کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔[۱۶]

دفاعِ قراءت

اس کتاب میں علامہ تمنا عمادی (م۱۹۷۲ء) کی تالیف 'اعجاز قرآن اور اختلاف قرأت' میں قراءاتِ متواترہ اور سبعۃ احرف پر اٹھائے گئے اعتراضات وشبہات کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: نقاط واعراب قرآن

باب دوم: قرأتِ سبعہ متواترہ سماعی وتوقیفی، نیز قرأتِ متواترہ کے مقابلے میں روافض وملاحدۂ کوفہ کی جعلی ومن گھڑت قرائتوں کی سازش۔

باب سوم: حدیث سبعۂ احرف کا متواتر وقطعی الثبوت ہونا۔

باب چہارم: قرّائے سبعہ پر جرح وقدح اور اس کا دفاع وردّ۔

مصنفِ کتاب کی نظر میں علامہ تمنا عمادی بنیادی طور پر چھ(۶) طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں:

۱۔فن قرأت کے رجال کو حدیث کے رجال پر قیاس کیا ہے، حالاں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

۲۔ رجالِ قراءت میں سے کسی قاری یا راوی کو جب کسی محدث نے 'ضعیف فی الحدیث' کہہ دیا تو آپ نے اس کو قراءت میں بھی ضعیف کہہ دیا۔ حالاں کہ کسی ایک فن میں کمال حاصل نہ ہونے سے دوسرے فن کا عدم کمال قطعاً لازم نہیں آتا۔

۳۔اقوالِ شاذہ یا اقوالِ روافض کی بنیاد پر کئی رجالِ قرأت کو رافضی قرار دے دیا۔

۴۔تحریکِ قرأت کو اہل کوفہ کے ملاحدہ اور ان کے اعجمی موالی کی سازش قرار دیا ہے۔

۵۔قرأتِ متواترہ کو غیر محفوظ قرار دیا ہے۔

۶۔سبعۃ احرف والی متواتر وقطعی الثبوت حدیث کو موضوع بتایا ہے۔[۱۷]

کتاب نوسودس (۹۱۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں خلاصۂ کتاب بیان کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اختلافِ قرأت اور سبعۂ احرف سے متعلق انچاس (۴۹) شبہات کے جوابات دیے ہیں۔

کشف النظر ترجمہ وشرح 'النشر فی القرأت العشر'

یہ امام محمد بن الجزریؒ (م۸۳۳ھ) کی کتاب 'النشر فی القرأت العشر' کا ترجمہ وشرح ہے۔ امام جزریؒ کی مذکورہ کتاب کا شمارعلمِ قرأت کی امہات الکتب میں ہوتا ہے۔ اس میں قرأتِ عشرہ، ان کے اصول وفروع، اختلافات مع دلائل وتوجیہات اور قرائے عشرہ سے متعلق نوسو بیاسی (۹۸۲) قوی ومستند طرق نہایت تحقیق سے بیان کے گئے ہیں۔ قاری صاحب نے اپنے استاد قاری رحیم بخش کے حکم سے اس کتاب کو اردو قالب میں ڈھالا تھا۔ اس کی ابتدا میں ایک مفصل مقدمہ ہے، جو اپنے قیمتی مباحث کے باعث اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کے چار حصے ہیں:

حصہ اول: اس میں مبادئ قرأت، خلط فی الروایہ، خلط فی الطریق، قراءت، روایت اور طریق کا فرق، اختلاف واجب وجائز، قیاس مطلق ومقید جیسے امور بیان کیے گئے ہیں۔

حصۂ دوم: اس میں تاریخ وآدابِ قرآن، رسم واصول قراءات اور حدیث سبعۂ احرف سے متعلق مباحث ہیں۔

حصۂ سوم: اس میں دس (۱۰) قاریوں اور ان کے بیس (۲۰) راویوں کے مفصل حالات وسوانح مذکور ہیں۔

حصۂ چہارم: اس میں امام ابن الجزری کا طویل ومبسوط تذکرہ ہے۔[۱۸]

مصنف نے دوسری جلد کے مقدمے میں حدیث نبوی 'انّ القرآن اُنزل علی سبعۃ اُحرف'[۱۹] کی شرح کرتے ہوئے 'سبعۂ احرف' کی توجیہ میں چھ (۶) اقوال بیان کیے ہیں، جن میں پانچویں قول کی نسبت کرنے میں ان سے تسامح ہوا ہے۔ انہوں نے اسے امام ابوالفضل عبدالرحمٰن بن احمد رازی (م۴۵۴ھ) کی طرف منسوب کیا ہے، جو درست نہیں ہے۔

وہ فرماتے ہیں: ''پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے تلفظ کے سات مختلف طریقے مراد ہیں:

امام مالک بن انس، محقق ابن الجزری، ابوالفضل رازی، ابن طیب باقلانی اور ابن قتیبہ رحمھم اللہ کا ہے۔''[۲۰]

اس قول کی نسبت امام رازیؒ کی طرف درست نہیں۔ کیوں کہ انہوں نے اپنا مختار مذہب اپنی کتاب 'معانی الأحرف السبعۃ' میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''فأما ما أعتقده في الخبر من وراء ما ذكرتُه، وهو أسلم المذاهب؛ وهو التوصل إلى ما كُلّفنا بهذه الأخبار والإمساك عما كفينا منها''۔[۲۱]

(میرے نزدیک جو رائے درست ہے اور جس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا، وہ یہ ہے کہ انہی قراءات کو پڑھیں جن کا ہمیں حدیث میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور عدم علم کی بنا پر کسی بھی ثابت شدہ قرأت کا انکار نہ کریں۔)

تاریخِ علم تجوید

علم تجوید کی تاریخ پر اڑتالیس صفحات کا یہ مختصر رسالہ ہے، جس میں واضعِ علم تجوید خلیل بن احمد الفراہیدی (م ۱۷۰ھ) سے لے کر دور حاضر تک کی تاریخ نہایت مختصر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ خاص طور پر دہلی اور پانی پت میں علم تجوید کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس فن کی ضرورت واہمیت، ادلۂ اربعہ سے وجوبِ تجوید کے دلائل، علم تجوید کے فوائد، منکرینِ تجوید کے شبہات اور ان کے جوابات، تجوید وقرأت سے متعلق فقہی مسائل، جمعِ قرآن وتشکیلِ قرأت کی تاریخ پر بھی کلام کیا ہے۔

کاتبانِ وحی

اس کتاب میں دورِ نبوی میں وحی لکھنے والے چھپن (۵۶) صحابۂ کرام کے حالات درج ہیں۔ مؤلف نے کاتبانِ وحی کی پانچ اقسام بیان کی ہیں:

قسم اول: کاتبانِ نبی، وہ حضرات جن کے بارے میں تصریح موجود ہے کہ

رسول اللہ ﷺ ان سے قرآنی آیات اور خطوط و مراسلات لکھواتے تھے۔ یہ چونتیس (۳۴) ہیں۔

قسم دوم: کاتبانِ جامعین، وہ حضرات جن کے بارے میں یہ صراحت تو نہیں کہ آں حضرت ﷺ ان سے براہ راست لکھواتے تھے، البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ یہ حضرات اپنے طور پر قرآن مجید کو کتابت و تحریر کے ذریعے سے ضبط اور جمع فرماتے تھے۔ یہ چھ (۶) ہیں۔

قسم سوم: کاتبانِ مصاحف، وہ حضرات جن کے بارے میں کاتبانِ رسول ہونے کی تصریح موجود ہے نہ کاتبانِ جامعین ہونے کی وضاحت؛ البتہ یہ معلوم ہے کہ انھوں نے عثمانی مصاحف کی کتابت و تحریر میں حصہ لیا۔ یہ تین (۳) ہیں۔

قسم چہارم: کاتبانِ حدیث، وہ حضرات جن کے بارے میں مندرجہ بالا تین قسموں میں سے ہونے کی صراحت نہیں، البتہ یہ بات ثابت ہے کہ یہ حضرات حدیث لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ یہ سات (۷) ہیں۔

قسم پنجم: کاتبانِ محض، وہ حضرات جن کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ لکھنا جانتے تھے۔ یہ چھ (۶) ہیں۔[۲۲]

کاتبانِ وحی کی مندرجہ بالا قسمیں بیان کرنے کے بعد مؤلف نے حروفِ تہجی کی ترتیب سے ان صحابہ کے تفصیلی حالات قلم بند کیے ہیں۔

سلک اللآلی والمرجان شرح نظم احکام الآن

یہ علامہ محمد بن احمد متولی (م۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء) کے قصیدے 'نظم أحكام قوله تعالى الآن' کی شرح ہے۔ یہ قصیدہ سینتیس (۳۷) اشعار پر مشتمل ہے، جس میں موصوف نے اختلافی کلمات میں سے فقط ایک ہی کلمہ 'الآن'[۲۳] کے احکام و مضامین، اس کی صحیح وجوہ اور ان کے دلائل و اسباب و علل پر صرف روایتِ ورش کے موافق تفصیل سے کلام کیا ہے۔ قصیدے کا اسلوب و زبان دقیق ہونے کی وجہ سے اس کی شرح کی ضرورت تھی، اس لیے شارح نے اہلِ ذوق کے لیے اردو میں ترجمہ و شرح کے ذریعے اس نظم کی مشکلات کو حل کیا ہے۔

ضیافتِ مدینہ

بیس (۲۰) صفحات پر مشتمل یہ تحقیقی انداز کا مضمون ہے، جس میں سبعۂ احرف کے ضمن میں بیان کی جانے والی احادیث کو پانچ اقسام کے تحت جمع فرما کر ہر قسم کا مصداق متعین کیا ہے، جس سے اس موضوع پر بہ ظاہر متعارض نظر آنے والی احادیث میں تطبیق کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور حدیث 'سبعۂ احرف' کا مفہوم کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

علاوہ ازیں اس مضمون میں آپ نے، ایک ہی کلمے میں مختلف قرأت کی صورت میں پیدا ہونے والی متنوع تفاسیر، دورِ عثمانی میں بعض سبعۂ احرف و لغات کی موقوفیت، عرضۂ اخیرہ میں باقی رہ جانے والے اختلافاتِ قرأت، لغت قریش کی جامعیت اور مصاحف عثمانی میں تمام سبعۂ احرف کے وجود پر بھی جامع اور شاندار کلام کیا ہے۔

آپ کا یہ مضمون مولانا عبدالشکور ترمذیؒ کے حالات پر لکھی گئی کتاب 'حیاتِ ترمذی' میں موجود ہے۔[۲۴]

اہلِ فن سے خط و کتابت

قاری طاہر رحیمی کی مختلف علمی موضوعات پر اہلِ علم وفن سے خط و کتابت رہی۔ ان میں سے کئی خطوط فن قرائت کے دقیق مباحث پر مشتمل ہیں۔ اس موضوع پر جن اصحابِ علم سے آپ کی خط و کتابت رہی، ان میں قاری اظہار احمد تھانوی، قاری ادریس العاصم، قاری احمد میاں تھانوی صاحب اور قاری شفیق رحیمی کے نام شامل ہیں۔

علومِ حدیث میں خدمات

علوم حدیث میں بھی آپ کی بعض تصانیف ہیں، جو اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ماینفع الناس فی شرح 'قال بعض الناس'

امام بخاریؒ نے اپنی 'صحیح' میں امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام ابان بن عیسیٰ اور امام محمد رحمہم اللہ کے بعض اقوال اور فقہی مسائل کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔[۲۵] جنھیں وہ قال

بعض الناس' کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں۔ یہ کل پچیس (۲۵) مقامات ہیں۔

مؤلف سب سے پہلے امام بخاریؒ کے باب لانے کی غرض بیان کرتے ہیں، اس کے بعد مذکورہ باب میں ذکر کیے گئے مسئلے کی توضیح کرکے اس میں موجود ائمہ کا اختلاف مع دلائل و جوابات ذکر کرتے ہیں۔ بعد ازاں 'قال بعض الناس' کا عنوان قائم کرکے امام بخاریؒ کا اعتراض نقل کرتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں۔

زبدۃ المقصود فی حل 'قال ابوداوٗد'

امام ابوداوٗدؒ اپنی 'سنن' میں احادیث ذکر کرنے کے بعد ان پر مختلف انداز سے اپنی رائے دیتے ہیں۔ یہ آرا یا اقوال عام طور پر دقیق و پیچیدہ مباحث پر مشتمل ہیں، جن میں اسانید و متون کے اختلافات و اضطرابات، جرح وتعدیلِ رواۃ اور نکارۃِ احادیث جیسے مباحث شامل ہیں۔ مؤلف نے اس کتاب میں امام ابوداؤدؒ کے اِن اقوال کو جمع کرکے 'باب طول القیام من الرکوع' تک شرح کی ہے اور اس کے بعد کے اقوال کو چھوڑ دیا ہے۔ شرح میں بنیادی طور پر مولانا شریف کشمیری کی تقاریر اور مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی 'بذل المجہود' سے استفادہ کیا گیا ہے۔ [۲۶]

عمدۃ المفہم فی حل مقدمۃ مسلم

یہ مقدمہ صحیح مسلم کی شرح ہے۔ شروع میں ایک مختصر مقدمہ مبادی حدیث پر ہے، جس میں حدیث کے معنیٰ، حدیث و خبر کے درمیان نسبت، فضیلتِ علم حدیث، حجیتِ حدیث، ضرورتِ حدیث اور تاریخ تدوینِ حدیث پر بحث کی گئی ہے۔ نیز امام مسلمؒ کی شخصیت اور ان کی 'صحیح' ہر دو کے احوال اور منہج واسلوب پر کلام کیا گیا ہے۔ آخر میں سوالات وجوابات کی شکل میں مولانا محمد زکریاؒ کے 'مکتوباتِ علمیہ' سے صحیح مسلم کے بعض مشکل مقامات کا حل پیش کیا گیا ہے۔ [۲۷]

حواشی ومراجع

۱۔ دیکھیے: محمد طاہر رحیمی، سلک اللآلی والمرجان شرح نظم احکام الآن، ادارۂ نشر واشاعت اسلامیات، مسجد سراجاں حسین، ملتان، طبع دوم، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ء، ص: ۱۳۱، والیاس احمد حسین البروماوی،

امتاع الفضلاء بتراجم القراء، مکتبہ دارالزمان، طبع دوم، ۲۰۰۷ء، ۳۹۴/۱، وعزیز الرحمٰن، حضرت مولانا طاہر رحیمی مہاجر مدنی، مشمولہ ماہ نامہ الخیر، خیر المدارس، ملتان، شوال المکرّم: ۱۴۲۹، اکتوبر: ۲۰۰۸ء، جلد: ۲۶، ص ۳۹

۲۔ محمد طاہر رحیمی، دفاع قرأت، ادارۂ کتب طاہریہ، ملتان، ص ۹۱۰، سنہ اشاعت: ندارد

۳۔ ماہ نامہ الخیر، ملتان، اکتوبر ۲۰۰۸، ص: ۴۱۔

۴۔ حوالہ سابق: ص ۳۹

۵۔ محمد طاہر رحیمی، رہ نمائے مدرسین مع مسائل ارکان دین، جامعہ عبید الرحیم، جوہر ٹاؤن، لاہور، ص: ۲۰۶

۶۔ محمد طاہر رحیمی، زبدۃ المقصود فی حل قال ابوداؤد، ادارۂ کتب طاہریہ، ملتان، ص: ۳

۷۔ محمد طاہر رحیمی، دفاع قرأت: ص ۹۱۰

۸۔ ماہ نامہ الخیر، ملتان، نومبر ۲۰۰۸، ص: ۳۳

۹۔ الیاس احمد البرمادی، امتاع الفضلاء: ۳۹۵/۱

۱۰۔ دیکھیے: الیاس احمد البرمادی، امتاع الفضلاء: ۳۹۵/۱۔۹۷

۱۱۔ ماہ نامہ الخیر، ملتان، نومبر ۲۰۰۸، ص ۳۵

۱۲۔ اشرف علی تھانوی، جمال القرآن مع حاشیہ ایضاح البیان، مکتبۃ القراءۃ، ماڈل ٹاؤن، لاہور، ص ۵

۱۳۔ احمد میاں تھانوی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور علم تجوید وقرأت، ششماہی رشد، لاہور، قرأت نمبر، مارچ ۲۰۱۰ء، ص ۶۰۹

۱۴۔ محمد طاہر رحیمی، سوانح فتحیہ، ص ۵۱۱۔۵۱۲

۱۵۔ محمد طاہر رحیمی، کمال الفرقان شرح جمال القرآن، ادارۂ نشر واشاعت اسلامیات، ملتان، ص ۲

۱۶۔ محمد طاہر رحیمی، کمال الفرقان، ص ۲

۱۷۔ ملاحظہ کیجیے: محمد طاہر رحیمی، دفاع قرأت، ص ۸۴۔۸۹

۱۸۔ دیکھیے: محمد طاہر رحیمی، کشف النظر ترجمہ وشرح کتاب النشر فی القرأت العشر، ادارہ کتب طاہریہ، ملتان، ص: ۳۶۔۳۷

۱۹۔ بخاری: ۲۴۱۹

۲۰۔ محمد طاہر رحیمی، کشف النظر، ۵۹/۲۔

۲۱۔ ابوالفضل الرازی، عبدالرحمٰن بن احمد، معانی الاحرف السبعۃ، ت: حسن ضیاء الدین عتر، وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ، قطر، ط: ۱، ۲۰۱۱، ص ۳۵۲۔

۲۲۔ دیکھیے: محمد طاہر رحیمی، کابانِ وحی، مسجد سراجاں حسین آگاہی، ملتان، ص:۱۔۶

۲۳۔ سورۂ یونس، آیت:۵۱، ۹۱۔

۲۴۔ دیکھیے: عبدالقدوس ترمذی، حیاتِ ترمذی، جامعہ حقانیہ، سرگودھا، ط:۱۴۲۴ھ، ص:۲۶۳

۲۵۔ الکاشمیری، محمد انور شاہ، فیض الباری علی صحیح البخاری، ت: محمد بدر عالم میرتی، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ط:۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء، ۳/۱۶۱، وعبدالغنی الغنیمی المیدانی، کشف الالتباس عما اورده البخاری علی بعض الناس، ت: عبدالفتاح ابوغدة، مکتب المطبوعات الاسلامیة، حلب، ط:۱، ۱۹۹۳م، ص۱۶۰۔

۲۶۔ دیکھیے: طاہر رحیمی، زبدة المقصود فی حل قال ابوداؤد، ادارہ کتب طاہریہ، ملتان، ص۱۳۔

۲۷۔ دیکھیے: طاہر رحیمی، عمدة المفہم فی حل مقدمہ مسلم، ادارہ کتب طاہریہ، ملتان، طبع:۷، ۱۹۹۱، ص:۷

تہذیب وسیاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار

(مقالاتِ سمینار)

مرتبین: ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحیؒ/مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کی جانب سے منعقدہ سمینار مؤرخہ ۲۳-۲۴/فروری ۲۰۱۴ء کے مقالات کا مجموعہ، جس میں تحریک اسلامی ہند کے اکابر اور قائدین کے خطبات کے علاوہ ملک کے ممتاز مفکرین اور دانش وروں کے کل چھتیس (۳۶) مقالات شامل ہیں۔ ان مقالات میں تہذیب وسیاست کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، جن میں مغربی اور اسلامی تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی، ان کے درمیان موجود فرق وامتیازات، تہذیبوں کے تصادم کا موجودہ نظریہ، امت مسلمہ کی موجودہ تہذیبی وسیاسی صورت حال، قرآن مجید اور احادیث نبوی میں حکومت وسیاست کے تصورات، موجودہ طریقۂ انتخاب، پارلیمانی نظامِ حکومت، تکثیری معاشرے کے مسائل جیسے اہم مباحث اور معروف علمائے سلف اور جدید مفکرین کی وقیع کتب کے تجزیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔

یہ ایک ایسی دستاویز ہے، جو قوم وملت کی علمی رہ نمائی اور موجودہ پیچیدہ حالات کے تقاضوں کے فہم وادراک اور اس کی روشنی میں اپنے لائحۂ عمل کی تعیین میں ممد ومعاون ثابت ہوگی۔

دیدہ زیب ٹائٹل، بہترین کاغذ اور معیاری طباعت

کل صفحات ۸۳۶، قیمت: ۶۰۰ روپے صرف

ملنے کے پتے

مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، جمال پور، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، D-307، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

تعارف وتبصرہ

صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات — مولانا سید جلال الدین عمری

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، صفحات: ۳۸۴، قیمت -/۲۵۰ روپے صرف

(پروفیسر کنور محمد یوسف امین فلاسفی سائنس فورم، دہلی کاؤنسل آن فلاسفیہ ریسرچ، اور سینٹر فار اسٹڈی اینڈ ریسرچ، نئی دہلی کے ڈائریکٹر ہیں۔ انھوں نے مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب 'صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات' پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ یہ اس فن کے ایک معتبر شخص کا تبصرہ ہے۔ اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کی طرف بھی بعض اہلِ علم نے توجہ دلائی ہے۔ (رضی الاسلام)

دورِ حاضر کے منفرد اور الجھے ہوئے حالات میں طب وصحت کے دائرے میں مطالعے اور تحقیق کے لیے، خواہ اسلامی تناظر میں ہو یا علی العموم، دونوں پہلوؤں سے اگر کوئی ایک مرجع طلب کیا جائے تو راقم کے نزدیک مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' کا ذکر کیا جائے گا۔ بیس برس تک آپ جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر رہے۔ اس کے بعد مسلسل تین میقات (۱۲ر برس) اس کی امارت کے منصب پر فائز رہے۔ لیکن آپ کی شخصیت کا دوسرا اور اہم پہلو یہ ہے کہ آپ نے جامعہ دار السلام، عمر آباد، تمل ناڈو، میں علم دین کی تکمیل کے بعد، اپنی پوری زندگی اعلیٰ درجے کی علمی کاوشوں اور گہرے مطالعہ وتحقیق میں گزاری۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء سے ۲۰۰۰ء تک آپ معروف تحقیقی ادارے 'ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ' کے سکریٹری رہے اور اس کے بعد تا حال صدر ہیں۔

مولانا عمری کی انتہائی بنیادی اور دیگر کتابوں سے بے نیاز کردینے والی تصنیفات میں زیرِ نظر کتاب اور 'معروف ومنکر'، 'اسلام: انسانی حقوق کا پاسبان' اور 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' جیسی تصنیفات شامل ہیں۔ ان گراں مایہ تحریکی اور علمی خدمات کے ساتھ انھوں نے نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی علمی راہ نمائی اور تربیت بھی کی، جن میں انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کے مصداق، راقم بھی شامل

ہے، جس کے کانوں میں ان کا یہ قول ہمیشہ گونجتا رہتا ہے جو مکمل تفہیم القرآن کے مطالعے کے بعد انھوں نے فرمایا تھا کہ ''ترجمۂ قرآن دوبارہ سے جتنی تیزی سے ممکن ہو، پڑھ لو، تاکہ قرآن کریم کی مجموعی تعلیمات سے ممکنہ آگاہی ہو جائے۔''

راقم کا تعلق پچھلے چالیس سال سے ایک جانب جدید طب، طب یونانی، اور تحقیق کے دائرے میں، آیوروید اور روایتی چینی طب سے اور دوسری طرف علمی اور اسلامی موضوعات، خاص طور پر روایتی فلسفے سے بھی رہا ہے۔ چنانچہ اپنی مختلف طبی تحقیقات کے دوران میں نیز دیگر طبی محققین کی نگارشات کا جائزہ لیتے وقت اسی کتاب نے راقم کی سب سے زیادہ مدد کی ہے۔

دور حاضر میں موجود مطالعہ و تحقیق کی انواع میں یہ کتاب فقہ اسلامی اور معاشرتی علوم (Social Sciences) دونوں کے مناہج کو سموئے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس میں ایک جانب فقہی استناد موجود ہے تو دوسری جانب عصری، سماجی علوم کا انسانی زندگی سے ربط و تعلق بھی از اول تا آخر نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا علوم دینیہ سے متعلق محکم کردار آخر میں درج کتابیات سے واضح ہے، جہاں پوری اسلامی تاریخ پر محیط تمام بنیادی علوم دینیہ کے مصادر درج نظر آتے ہیں، یعنی تفسیر، حدیث و شروح حدیث، فقہ، مقاصد شریعت و اسرار شریعت وغیرہ، نیز طبری (۲۲۴-۳۱۰ھ)، زمخشری (۴۶۷-۵۳۸ھ) اور رازی (۵۴۴-۶۰۴ھ) جیسے متقدمین، ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) وابن قیم (۶۹۱-۷۵۱ھ) جیسے دورِ متوسط کے علماء، اور شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ) جیسے متأخرین، نیز شیخ البانی (۱۳۳۳-۱۴۲۰ھ) اور شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری (۱۲۸۳-۱۳۵۳ھ) جیسے عصری محققین بھی موجود ہیں۔ دوسری جانب کتاب کے پیشِ لفظ اور باب اول میں موجودہ دور میں 'صحت اور مرض کے مسائل' کے عنوان کے تحت صنعتوں کی کثرت، خاندانی نظام کی ابتری، علاج کا گراں ہونا، جدید طب کی بعض خامیاں، جیسے امور زیر بحث آئے ہیں۔ دوسری طرف انسان کے نشو نما میں دوسرے انسانوں کا تعاون جیسے تقریباً تمام اہم سوالات کا جواب کتاب کے معاشرتی علمی (Social Scientific) کردار کا پتہ دیتی ہے۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی، جو سب سے پہلے مطالعہ وتحقیق سے تعلق رکھنے والوں کی توجہ منعطف کرتی ہے، یہ ہے کہ اس میں بڑی تعداد میں نئی اور قیمتی معلومات اور محاکمات موجود ہیں، مثلاً صحت میں بچوں اور جوانوں کے لیے کھیل کود اور عمر کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے تفریحات کا کردار، عیادت کی دینی ہمت افزائی اور اس کی افادیت سماجی، طب کا تعلق، طب یونانی کے نظریۂ 'کیفیات سرد وگرم' اور نبوی غذائی تعلیمات کا تعلق، حفظِ صحت کے پہلو سے کھیل کود کا شرعی حدود میں جواز، دورِاول میں گھڑ سواری کی اہمیت اور گھوڑے کے حسن کا حوالہ، یہ اور اس جیسے متعدد نکات کتاب میں موجود بحثوں کی ندرت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اپنی نوعیت کی اس منفرد کتاب کی اساسیات میں ایک نرالا منہج تحقیق بھی شامل ہے، یعنی ایک باب میں طب وصحت سے متعلق بنیادی، عصری موضوعات کا درج کرنا اور دوسرے باب میں اسلام کی متعدد بنیادی طبی تعلیمات کو پیش کرنا اور بعدازاں عصری خیالات اور ضروریات کا تعلق اسلامی تعلیمات سے بٹھانا اور اسلامی تعلیمات کا تعلق علم معاشرت میں موجود طبی سوالوں اور ان کے حل سے وابستہ کرنا، ایک نیا تخلیقی اور ثمر آور منہج ہے۔

اس تصنیف کی ایک اور بنیادی خوبی اس کی وسعت ہے۔ فقہی اور مسلکی لحاظ سے بھی اور موضوعی لحاظ سے بھی۔ موضوعی وسعت کا اندازہ مندرجہ بالا سطور اور مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ فقہی وسعت پر اطلاع اس امر سے کی جا سکتی ہے کہ اس میں ایک جانب علاج کے لیے حلال چیزوں کو اختیار کرنے کی فضیلت کا بیان ہے اور دوسری جانب اضطراری حالات میں محرمات سے علاج، غیر مشرکانہ جھاڑ پھونک کی اجازت اور ان جیسے مسکوت عنہ مباحث موجود ہیں۔ اباحیت پسندی کے اس دور میں، جب کہ ہر صحیح تحقیقی نتیجے کے ساتھ کم از کم دو انتہائی گمراہ کن بیانات بھی موجود ہوتے ہیں، اس تصنیف کا یہ امتیاز اس کی وقعت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اس کے تمام مندرجات ہمارے خیال میں پوری طرح صائب اور مستند ہیں۔ چنانچہ نوادرات کے جویا، تخلیقی ذہنیت رکھنے والے محقق اس کتاب کی پرکشش اور نادر پیش کش کو عدمِ اصابت کے خوف کے بغیر

اختیار کر سکتے ہیں۔ راقم کی محدود نظر میں اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی اصابت رائے اور استناد ہے، خاص طور پر اس کے نوادرات اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اس تصنیف کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو صحت و مرض کے تعلق سے اسلامی تعلیمات کے بہت بڑے حصے کا احاطہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر قاری مطمئن ہو سکتا ہے کہ اس نے اسلام کی طبی تعلیمات کے ایک بڑے دائرے سے واقفیت حاصل کر لی ہے۔ اس طرح کی تصنیفات سے اس کتاب کے امتیازات میں ایک چیز یہ بھی شامل ہے کہ اس میں طب مغربی، جس کو آج کل طب جدید کہا جاتا ہے، اس کا ایک اچھا، ناقدانہ فہم اور تجزیہ بھی شامل ہے۔

فاضل مصنف نے اسلامی طبی تعلیمات کے طب یونانی سے تعلق کے کچھ حصے کو بھی ضمنی طور پر بیان کیا ہے۔ مثلاً حدیث میں کھجور اور کھیرا ملا کر کھانے کو کہا گیا ہے، اس لیے کہ ان میں سے ایک 'گرم' اور دوسرا 'سرد' ہے، ان کے ملانے سے اعتدال حاصل ہوتا ہے۔ یہ طب کے 'نظریۂ کیفیاتِ اربعہ' کے مطابق ہے۔ لیکن یہ بھی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طب یونانی کا جو زیادہ وسیع تعارف اور تناظر قائم کرنا ضروری ہے، وہ اس کتاب میں نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی طبی تعلیمات اور ان کے منافع کو پوری طرح سمجھنے کے لیے طب یونانی کا تجزیاتی تناظر سامنے رکھنا بہت ضروری ہے، مثلاً قرآنی آیات کی تلاوت اور دعاؤں وغیرہ سے روحانی علاج انجام دینا طب مغرب کے تناظر میں علمی اور معروضی لحاظ سے نہیں سمجھا جا سکتا، کیوں کہ طب مغربی میں انسان کو محض مادے سے بنا ہوا مانا جاتا ہے، جب کہ طب یونانی میں انسان کے مادی پہلو کے ساتھ لطیف اور روحانی پہلو رکھنے کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً انسان کے اندر موجود تین قوتوں میں سے ایک یعنی قوت نفسانی کی مزید تقسیم میں 'قوتِ عاقلہ' کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، جو کہ 'عقل فعال' سے تعلق قائم کرتی ہے اور یہ عقل فعال جبریلؑ کے ایک کلیدی کردار سے عبارت ہے۔

زیرِ بحث کتاب کا ایک قابل لحاظ حصہ طبی اخلاقیات پر مشتمل ہے، جس میں جدید انتشارِ فکری مثلاً اختیاری قطع حیات وغیرہ کا اچھا جائزہ لیا گیا ہے، لیکن راقم کو چوں کہ طبی فلسفے کے علی الرغم طبی اخلاقیات میں زیادہ دل چسپی نہیں ہے، اس لیے اس

جائزے میں اخلاقیات کے دائرے سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

بہ طور خلاصہ کہا جا سکتا ہے کہ طبی مطالعے اور تحقیقی دائرے میں یہ کتاب بہت قیمتی ہے۔ اس لیے کہ یہ دین کی تقریباً تمام تعلیمات اور عصری فکر وتہذیب کے تقریباً تمام طبی پہلوؤں کا صائب اور قابلِ اعتماد احاطہ کرتی ہے، جس کے نتیجے میں اس دائرے میں مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہت بہتر سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن زیادہ معروضی اور وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کتاب کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ اسلام کی خدا داد اساسیت اور جامعیت کے سبب، نیز اسلامی تہذیب میں مسجدِ نبوی کے صفہ کے تسلسل، یعنی مدارس اسلامیہ کی منہج اور محنت شاقہ کی تربیت سے پیدا ہونے والا ذہن، نہ صرف علومِ دینیہ، مثلاً فقہ وغیرہ جیسے مشکل مضامین کا دوٹوک جائزہ اور بیان کرنے کی استعداد پیدا کرتا ہے، بلکہ کسی بھی زمانے کے نئے فکری او تہذیبی پہلوؤں کو ان کے براہِ راست مطالعے کے بغیر بھی صحیح طور پر سمجھنے اور دین و فلسفے کے اصولوں سے درست تعلق قائم کرنے اور نتیجہ خیز انجام تک پہنچنے کی صلاحیت اور استعداد بھی عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے نہ صرف طب وصحت کے متعلق بیش تر دینی اور فقہی تعلیمات کا احاطہ کیا ہے، بلکہ عصری دائروں اور سوالوں کا نہایت عالمانہ اور معروضی جائزہ بھی لیا ہے۔ پہلے دائرے کے لیے انھیں ضروری تعلیم وتربیت حاصل تھی، لیکن دوسرا دائرہ بغیر کسی براہِ راست منظّم تعلیم وتربیت کے انجام دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی کتابیات کی فہرست میں عصری حقائق کے حوالے کے طور پر صرف چند اخبارات اور جرائد کے حوالوں کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔ یہ ایک علمی خامی ہے۔ تعلیمی اور تحقیقی زندگی گزارنے والے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ صحافت کے ہلکے پھلکے بیانات سے عصری طبی سوالات کا گہرا فہم حاصل کرنا، کس درجے کی فکری اور ذہنی قوت اور انضباط کا سراغ دیتے ہیں۔ چنانچہ مدارسِ دینیہ میں عصری علوم کی بالاستیعاب تعلیم کی غیر موجودگی سے کچھ زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے باوجود یہ کتاب اسلامیات کے میدان میں ایک قیمتی اضافہ ہے، جس سے موضوع کا مطالعہ کرنے والا بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

(کنور محمد یوسف امین)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی (۸۲)

☆ شانتی پرکاشنا پبلشرز بنگلور نے صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی سات (۷) کتابوں کا کنڑ میں ترجمہ شائع کیا ہے: (۱) اسلام کی دعوت (۲) اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور (۳) انسان اور اس کے مسائل (۴) غیر اسلامی ریاست اور مسلمان (۵) اسلام اور وحدت بنی آدم (۶) قرآن کا نظامِ خاندان (۷) اللہ تعالیٰ کا دین نوجوانوں سے کیا چاہتا ہے؟

☆ مولانا سید جلال الدین عمری ۳۱/اکتوبر ۲۰۲۱ء کو ادارہ تشریف لائے اور دو روز قیام کیا۔ رفقاء و اسکالرس کے ساتھ متعدد جائزہ نشستیں منعقد ہوئیں۔ آپ کی آمد کی مناسبت سے یونی ورسٹی کے اہل علم کے ساتھ بھی تبادلۂ خیال کے لیے ایک نشست رکھی گئی۔ مولانا نے ان سے ادارے کی سرگرمیوں میں شرکت اور تعاون کا کرنے کی درخواست کی۔

☆ ۷ا/اکتوبر کو ادارہ میں جناب ہشام اجمل (ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی کے صاحب زادے) تشریف لائے تو ان کے ساتھ ادارہ کے رفقاء اور اسکالرس کی علمی نشست منعقد کی گئی۔ موصوف نے ڈیجیٹل لائبریری سے استفادہ کا طریقہ کار اور آن لائن مکتبات کے تعارف کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

☆ ۲۰/اکتوبر کو ڈاکٹر محمد خالد اعظمی (ایسوسی ایٹ پروفیسر شبلی کالج، اعظم گڑھ) کا ایک توسیعی خطبہ 'علم معاشیات، معاشی بحران اور جدید چیلنجز' کے عنوان پر منعقد ہوا۔ خطبہ کے بعد اسکالرس نے سوالات کیے، جن کے ڈاکٹر اعظمی نے اطمینان بخش جواب دیے۔

☆ ۳۰/اکتوبر کو جناب ذاکر اعظمی ندوی (ریاض) کی ادارہ آمد پر ایک نشست منعقد کی گئی۔ اس میں گفتگو کرتے ہوئے موصوف نے اسکالرس سے کہا کہ دنیا کی مروجہ زبانیں سیکھیں، کثرتِ مطالعہ کی عادت ڈالیں، مطالعہ کے دوران اختلافی باتوں کو نوٹ کریں اور حاصل مطالعہ کو قلم بند کرنے کی عادت ڈالیں۔

☆ ۴/نومبر کو ادارہ میں پروفیسر محمد ادریس کی صدارت میں 'مطالعۂ سیرت النبیؐ: ابعاد و جہات' کے عنوان سے اسکالرس سیمینار کا انعقاد ہوا۔ اس میں ادارہ کے اسکالرس نے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کیے۔ اخیر میں صدر مجلس نے مقالات پر

مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ نویسی کے آداب بتائے۔

☆ ۷/ نومبر ۲۰۲۱ء کو ادارہ میں 'مطالعۂ سیرت کانفرنس' کا انعقاد ہوا۔ اس میں پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، پروفیسر کنور محمد یوسف امین، ڈاکٹر مولانا سید طیب رضا نقوی اور ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے خطاب کیا۔ جناب ایس امین الحسن (نائب امیر جماعت اسلامی ہند) نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اخیر میں صدرِ مجلس ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے ادارۂ تحقیق کی خدماتِ سیرت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حالیہ دنوں میں دشمنانِ اسلام نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے بارے میں بہت گھناؤنی باتیں کہی ہیں۔ ان پر مشتعل ہونے کے بجائے تحمل اور سنجیدگی کے ساتھ آپؐ کی پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ تعلیمات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ ۱۸/ دسمبر کو ادارہ میں جناب ٹی عارف علی (قیم جماعت اسلامی ہند) تشریف لائے۔ اس موقع پر ادارہ کے کونسل روم میں رفقاء و اسکالرس کے ساتھ خصوصی نشست منعقد ہوئی۔ آپ نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسکالرس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو یہاں جو وقت ملا ہے، اس کا بھر پور استعمال کریں، زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں، لائبریری سے خوب فائدہ اٹھائیں۔ اخیر میں خازنِ ادارہ جناب نسیم احمد خاں نے مہمان گرامی کا شکریہ ادا کیا۔

☆ ادارہ کے محققین نے اپنے تصنیفی پروجیکٹ مکمل کر لیے ہیں۔ ان کے مشمولات سے اسکالرس کو متعارف کرانے کے لیے ۲۲/ دسمبر بروز بدھ ادارہ میں ایک مذاکرہ کا انعقاد ہوا۔ مولانا محمد کمال اختر قاسمی نے اپنی کتاب 'عصر حاضر میں فکری و سماجی تبدیلیاں اور اسلام کی رہ نمائی'، مولانا محمد جرجیس کریمی نے اپنی کتاب 'ظلم و استبداد کا خاتمہ: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں' اور مولانا محمد انس مدنی نے اپنی کتاب 'نومسلموں کے مسائل اور ان کا حل' کا تعارف پیش کیا۔ مصنفین سے سامعین نے ان کے موضوع سے متعلق سوالات کیے، جن کے انھوں نے جواب دیے۔ اخیر میں صدرِ مجلس سکریٹری ادارہ مولانا اشہد جمال ندوی نے مصنفین کو ان کی علمی و تحقیقی کاوشوں پر مبارک باد پیش کی۔ مذاکرے میں مہمانِ خصوصی

پروفیسر محمد ادریس کے علاوہ ادارۂ علوم القرآن کے رفقاء بھی شریک رہے۔

☆ تصنیفی اکیڈمی مرکز جماعت اسلامی ہند کی جانب سے منعقدہ ورک شاپ (۲۷۔۲۸؍نومبر ۲۰۲۱ء) میں سکریٹری ادارہ مولانا اشہد جمال ندوی، ارکانِ ادارہ: مولانا محمد جرجیس کریمی، مولانا کمال اختر قاسمی، محمد انس مدنی اور اسکالرس میں سے محمد طارق بدایونی، محمد صادر ندوی، سالم برجیس ندوی اور خبیب حسن سلفی نے شرکت کی اور بھرپور استفادہ کیا۔

☆ ۲؍دسمبر کو ادارہ میں مولانا اختر عالم اصلاحی تشریف لائے۔ انھوں نے ادارہ کی لائبریری کو کئی قیمتی کتابیں تحفے میں پیش کیں۔

☆ ۴؍دسمبر ۲۰۲۱ء سمینار کمیٹی کی پہلی نشست پروفیسر سید مسعود احمد کی صدارت میں منعقد ہوئی، جس میں طے پایا کہ 'قرآن اور سائنس: قرب وبعد اور تعاون باہم کی راہیں (Q uran and Science : Incompatibilities and Coherence) کے موضوع پر سمینار/ ویبینار ان شاء اللہ ۱۳؍مارچ ۲۰۲۲ء کو منعقد ہوگا۔

☆ کل ہند طلبۂ مدارس فورم و انجمن علماء اسلام کی جانب سے دس روزہ عالمی کانفرنس بہ عنوان 'ہندوستان میں مدارسِ اسلامیہ کا مستقبل' آن لائن منعقد ہوئی۔ اس میں مولانا محمد جرجیس کریمی اور مولانا کمال اختر قاسمی نے شرکت کی۔ مولانا کریمی نے 'دینی مدارس کی افادیت' اور مولانا قاسمی نے 'اسلامی نظام کے قیام میں مدارس اسلامیہ کا کردار' کے عنوان پر گفتگو کی۔

☆ ادارہ کی لائبریری کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش جاری ہے اور اہل علم سے مسلسل رابطہ ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں بیش قیمتی تصانیف ادارہ کو موصول ہو رہی ہیں۔ مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے ادارہ کی درخواست پر اپنی تمام مطبوعات کا ایک سیٹ ارسال کیا ہے، جو ایک سو چوراسی (۱۸۴) کتابوں پر مشتمل ہے۔ ادارہ نے ان کی خدمت میں مصنفین کی اہم تصانیف پیش کیں۔

☆ پروفیسر محمد ادریس کی سائنس لیکچر سیریز کے بعد اب ڈاکٹر محمد خالد اعظمی (ایسوسی ایٹ پروفیسر شبلی کالج، اعظم گڑھ) معاشیات پر لیکچر دے رہے ہیں۔ اب تک ان کے چار (۴) لیکچر ہو چکے ہیں اور انھیں ادارہ کے یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کر دیا گیا ہے۔

Qari Tahir has written books on Qur'aniyat, Hadith, Fiqh and other subjects. *Fazail-i-Huffaz-i-Qur'an*, *Kamal al-Furqan Sharah Jamal al-Qur'an*, *Difa'a Qira'at*, *Kashf al-Nazar Tarjuma wa Sharah al-Nashr fi al-Qara'at al-Ashr*, *Tareekh Ilm-i-Tajweed,m* and *Kaatiban-i-Wahi* are his famous books.

After presenting a brief life sketch of Qari Tahir Raheemi, this article introduces his works on Qur'aniyat and Hadith.

BOOK REVIEW

1. *Sehat -o- Maraz aur Islami Taleemat* (Health and disease and Islamic teachings),*Maulana Syyed Jalaluddin Umari*(Chairman Sharia Council, Jamat-e-Islami Hind), Markazi Maktaba Islami Publishers, New Delhi, Pages:384, Price 250/.

Reviewed by Prof. Kunwar Mohammad Yusuf Amin

religion they follow.

Although, under Islamophobia, an anti-Islam movement was run all over the world and efforts were made to prove that Islam is a terrorist religion yet facts and figures reveal that the number of converts to Islam at the international level is on an increase and after Christianity, Islam is the second largest religion in the world.

This article mentions the causes of conversion to Islam. The writer has written that Islam is the natural religion. It addresses all the spheres of human life. It establishes equality among all human beings. It guarantees rights of women and keeps women free from economic struggle. Owing to these causes people feel drawn towards Islam.

The Contribution of Qari Tahir Raheemi to the Art of Phonetic Recitation of Qur'an

Mr. Fazlur Rahman Mahmood
M.Phil (Islamic Studies)
Ph.D. Scholar, Department of Hadith,
International University, Islamabad

Qari Muhammad Tahir Raheemi (1939-2008) belonged to Jalandhar, a famous city in India. After partition he shifted to Pakistan, did specialisation in *Qira'at* from Jamia Khairul Madaris, Multan and was appointed teacher in that very university. Later on he went to *Madinah al-Munawwarah* and rendered his services as teacher there. His students are found in large numbers.

Morality is also a source of maintaining the foundation of culture. It helps reform the social life.

Allama Muhammad Iqbal (1877-1938) is a great poet, philosopher and religious scholar of the Indian subcontinent. He has enclosed all the spheres of life in his thought. An analysis of Iqbal's concept of morality reveals that he has presented the concept of *khudi* (self) for the development of personality. His philosophy of self consists of four factors: moral values, love, courage and freedom. Iqbal has laid much emphasis on the *tarbiyah* (training) of self. Because it develops human personality, strengthens it, and thus human life emerges as a perfect example. To him, morality is contingent on the person leading his/her life in accordance with the teachings of the Messenger ﷺ And it is with morality that a sort of exquisite beauty can be created in the collective character of nations.

This article discusses moral values in the light of Iqbal's thought and poetry.

The Present Trend of Conversion to Islam and Its Causes

Maulana Muhammad Anas Falahi Madani
Member, Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh
anasfalahi@gmail.com

Islam is a preaching religion. It enjoins its followers to convey the Message of Allah to His servants, but it strongly prohibits coercion or temptation. It leaves the addressees free to decide whether they accept Islam or continue with the

Shari'ah Position of Intercession

Professor Muhammad Saleem
Chairman Dept. of Theology(Sunni)
Aligarh Muslim University, Aligarh
msaleem196330@gmail.com

Vasila (intercession) means to seek access or come close to a person through the medium of something. Technically, it means the thing whereby one tries to come close to Allah the Exalted. The Qur'an and Sunnah deem three things lawful to be used as intercession: *Asma-e-Husna* (Names of Allah), noble deeds, and asking a noble person in his lifetime for supplication. The Ummah is united on the permissibility of these three things. However, they differ on whether or not the intercession of the Messenger of Allah ﷺ after he has passed away or of the saints and holy men who are now no more, during one's own supplication, is permissible. A large section of Ulama deems it impermissible, while some others hold it permissible.

This article analyses this issue in the light of the Qur'an, Ahadith and the opinions of Companions, and presents its analytical study.

The Concept of Moral Values in the Thought of Iqbal

Dr. Fayyaz Ahmad Farooq
Former Research Scholar, Islamic Studies Centre
Department of Islamic Studies
Bahauddin Zakariya University, Multan, Pakistan
fayyaahmadfarooq@gmail.com

Morality moulds and develops the personality of man. It enhances character and action and the entire way of life.

The Reality of Astrology

Dr. Ghulam Qadir Lone
Hadipora, Baramulla, Kashmir
dgqlone@gmail.com

There are many merits of astronomy. With the monthly and yearly calendar we ascertain times for ibadah (worship), get acquainted with seasonal changes, and fix dates for marriages and other functions. This is related to its scientific aspect. But about the movement of stars it is said for thousands of years that they influence the fate of human beings, their good and bad lucks, success and failure in the affairs of day-to-day life and the whole life.

The Qur'an and Ahadith mention the various aspects of stars. The stars are the adornment of the sky. They help us find ways on the land and in the darkness of seas, and devils are chased away thereby in the high skies. To know the future happenings with the help of astrology and to go to the fortune-teller are prohibited.

The Ulama of Islam have negated the effects of stars, and have considered it *shirk* (polytheism) to believe in the role of stars in making or marring the fate.

This article presents the teachings of the Qur'an and Ahadith on astrology and mentions the opinions of Ulama on the subject.

Abstract of the Articles

The Consultative System of Islam

Syed Jalaluddin Umari
President Idara Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh
And Chairman Shri'ah Council, Jamaat-e-Islami Hind

The Messenger of Allah ﷺ used to solve the State affairs directly in consultation with all the Muslims of Madinah and sometimes his consultation was limited to the representatives of the Muhajirin and the Ansar. There were representatives of the tribes in Arabia. They were called *Urafa*. During the reign of the Messenger of Allah ﷺ every tribe had a representative.

At times of *Ghazwa-e-Badr, Ghazwa-e-Uhud*, the Battle of Trench, *Ghazwa-e-Taif*, the Ifk incident and other occasions the Messenger of Allah ﷺ consulted his companions and acted accordingly. After he passed away, his companions nominated the Caliph with mutual consultation.

Mentioning the details of these incidents, this article proves that it was the sacred practice of the Messenger of Allah ﷺ to deal with the affairs with consultation. And thereby the Messenger ﷺ taught the Ummah to solve their issues with mutual consultation.

CONTENTS

ISSN:2321-8339

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI ALIGARH

Vol. 41 No.1

January - March 2022

Editor

Syed Jalaluddin Omari

Asstt. Editor

Mohammad Raziul Islam Nadvi

Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Nabi Nagar (Jamalpur)، P.O. Box: 93

ALIGARH - 202 002 (INDIA)

www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

رمضان کیسے گزاریں؟

خطبات سوم [حقیقت صوم وصلوٰۃ]	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	40.00
حقیقت عبادت اور روزے کا اصل مقصد	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	16.00
روزہ اور ضبط نفس	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	12.00
عید الفطر کس کے لیے	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	16.00
تفہیم الاحادیث جلد چہارم [روزہ، حج]	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ	500.00
رمضان المبارک سے استفادہ کی تدابیر	مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ	30.00
خطاب عید	مولانا سیّد جلال الدین عمری	12.00
پیام عید	مولانا سیّد جلال الدین عمری	10.00
کلام نبوت جلد دوم [نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج]	محمد فاروق خاں	265.00
رمضان تبدیلی اور انقلاب کا مہینہ	محمد فاروق خاں	30.00
...ان حضورؐ کی دعائیں	محمد فاروق خاں	55.00
رمضان کیسے گزاریں؟	خرم مرادؒ	28.00
رمضان کیسے گزاریں؟ [پاکٹ سائز]	خرم مرادؒ	12.00
رمضان المبارک	مولانا عبدالغفار حسن رحمانی	22.00
اعتکاف	ڈاکٹر تابش مہدی	15.00
روزہ اور رمضان	مولانا سراج الدین ندوی	30.00
رمضان المبارک عظیم کیوں؟	بنت الاسلام	48.00
اذکار مسنونہ	امام ابن قیمؒ	95.00
نماز اور اس کے اذکار	مولانا سیّد حامد علیؒ	25.00
نماز (کلاں)	مولانا نسیم غازی فلاحی	16.00
رمضان کے انعامات	ایمان مغازی	22.00
شب بے داری	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	15.00

آرڈر کے لیے رابطہ نمبر 7290092403 Mob: 7290092401, 7290092405

MMI PUBLISHERS مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Email: info@mmipublishers.net | mmipublishers@gmail.com | Web: www.mmipublishers.net

R.No. 38933/81
January-March 2022

Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

Mob. +91-9412671962
+91-9897746586

مولانا سید جلال الدین عمری کی تالیفات

شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیاتِ قرآن	۳۲۵/
۲	اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان	۹۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/
۴	کم زور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۵۰/
۶	خدا اور رسول کا تصور - اسلامی تعلیمات میں	۱۴۰/
۷	معروف و منکر	۱۸۵/
۸	اسلام کی دعوت	۲۲۵/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/
۱۱	تہذیب و سیاست کی اسلامی قدریں	۶۵/
۱۲	عورت - اسلامی معاشرے میں	۲۶۰/
۱۳	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ (مجلد)	۱۳۰/
۱۴	عورت اور اسلام • مجلد / ۱۱۰ • عام	۶۰/
۱۵	اسلام کا عائلی نظام	۱۰۵/
۱۶	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۴۲/
۱۷	قرآن کا نظامِ خاندان	۲۴/
۱۸	اسلام - ایک دینِ دعوت	۲۵/
۱۹	دعوت و تربیت - اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/
۲۰	راہیں کھلتی ہیں • مجلد / ۱۴۰ • عام	۹۵/
۲۱	سبیلِ رب - دعوت الی اللہ کا راستہ	۴۵/

شمار	نام کتاب	قیمت
۲۲	اوراقِ سیرت	۲۵۰/
۲۳	خطباتِ پاکستان	۱۰۰/
۲۴	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/
۲۵	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۲۶	اسلام اور مشکلات حیات	۴۵/
۲۷	خدا کی غلامی - انسان کی معراج	۱۴/
۲۸	اسلام اور وحدتِ بنی آدم	۱۶/
۲۹	اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور	۱۱۰/
۳۰	انفاق فی سبیل اللہ	۴۵/
۳۱	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۶/
۳۲	انسانوں کی خدمت - اسلام کی نظر میں	۱۶/
۳۳	جماعت اسلامی ہند - پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار	۴۳/
۳۴	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۱۸/
۳۵	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۳۶	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۳۵/
۳۷	بچے اور اسلام	۱۴/
۳۸	خاندان کی اصلاح اور اولاد کی تربیت	۲۰/
۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۲۵/
۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۴/

ملنے کے پتے:

۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ - ۲
۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی - ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵